(جملہ حقوق محفوظ)

مولانا شبلی

اردو کے بہترین انشا پرداز

اثر خامہ

سید انصاری، بی اے، (جامعہ ملیہ)

لکھنؤ کے قدیم خادم اردو رسالہ الناظر کے انعامی مقابلہ کا یہ بہترین مضمون ہے
جو الناظر بابت ماہ اپریل و مئی ۲۵ء میں شائع ہوا اور باضافہ دیباچہ
از جناب مولوی عبد الماجد دریابادی، بی اے
کتابی صورت میں شائع کیا جاتا ہے

باہتمام اسحاق علی علوی مالک و مہتمم

الناظر پریس واقع بلدہ لکھنؤ میں شائع ہوا

بار اول

جولائی ۱۹۲۵ء

قیمت ۱۰ر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گذارش

سعید انصاری صاحب، جن کا یہ مضمون ہے ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے ہین اور تحریر مضمون کے وقت جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ مین پڑھ رہے تھے ۔ جن حالات مین یہ لکھا گیا اوسکی کیفیت خود اون کی مندرجہ ذیل تحریر سے معلوم ہوگی جسمین اس بات کا جواب دیا گیا ہے کہ عجلت مین نظر ثانی نہو سکنے کی وجہ سے بعض غلطیان رہ گیین ۔

"مضمون کے بغیر نظر ثانی کئے ہوے چھپنے کا افسوس ہے لیکن یہ اطمینان ہے کہ تمام اغلاط کے مقابلہ مین میرا یہ عذر کہ مین ایک متعلم تھا" غالباً ہر شخص کے نزدیک مسموع ہوگا ۔

مزید برآن میرا بی اے کا امتحان سر پر تھا، ایک منٹ کی مہلت ملنی دشوار تھی، بہر حال کسی نہ کسی طرح لکھا لیکن کوئی ایسا نہ ملا جسے کم از کم ایک بار دکھا لیتا ۔ دسمبر کے آخری دو ہفتوں سے جنوری کے پہلے عشرہ تک میرے اساتذہ تعطیل مین اپنے اپنے [illegible] کو تشریف لیگئے تھے ۔ مری بیکسی کا یہ حال تھا کہ مین [illegible]

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ

بنا تھا ۔ [illegible] ۔ ۱۵ - ۱۵، ۲۰ - ۲۰۰ منٹ وقت نکالکر مضمون کا مسودہ تیار کر [illegible] پھر خود ہی صاف کرنے بیٹھتا، جو بحث طلب امور آتے اون کے متعلق اساتذہ سے استصواب راے کے بجاے مجبوراً اپنے ہم جماعتون سے گفتگو کر کے اطمینان کر لیتا ۔"

خوشی کی بات ہے کہ جس طرح سعید صاحب الناظر کے انعامی مقابلہ مین نمایان رہے اوسی طرح
اب بی اے کے امتحان مین بھی کامیاب ہوگئے ہین - انشاء اللہ آئندہ طباعت کے وقت نظر ثانی
کرکے وہ اون چند معمولی نقائص کو بھی دفع کردینگے جو اس وقت عجلت اور مصروفیت کے باعث رہ گئے
اس مضمون کی قدر و قیمت کا زیادہ صحیح اندازہ اوس وقت ہوسکیگا جب مقابلہ کے جملہ
مضامین کا مجموعہ شایع ہوگا - اسکے لئے ناظرین کو غالباً آئندہ سال تک انتظار کرنا ہوگا - البتہ
اس اثنا مین بعض مضامین الناظر مین شایع ہوسکین گے -
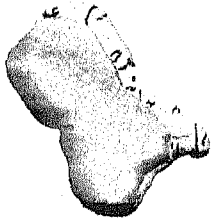
لکھنؤ یکم جولائی ۲۵ء

ظفر الملک

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

رسالۂ الناظر نے، جو ادب اردو کے ایک مشہور و قدیم مرکز (لکھنؤ) مین سالہا سال سے خدمات علم و ادب مین مشغول ہے، ادھر کچھ روز سے اپنے صفحات مین مقابلہ کے انعامی مضامین کا بھی سلسلہ قایم کیا ہے چنانچہ اُسنے پہلا عنوان یہ مقرر کیا کہ نثر اردو کے عناصر اربعہ "آزاد، نذیر احمد، حالی، و شبلی مین سب سے بہتر انشا پرداز کون ہوا ہے" اور ان مین سے اردو کی خدمت سب سے زیادہ کس نے کی ہے۔ اس عنوان سے متعلق متعدد مضامین موصول ہوے، جن مین سے بعض بڑی محنت و تلاش سے لکھے گئے تھے۔ اُن کی جانچ پانچ کہنہ مشق ارباب قلم کی ایک مجلس کے سپرد کی گئی، اس مجلس نے جس مضمون کو بہ حیثیت مجموعی سب سے بہتر، اور قابل انعام قرار دیا، وہ یہی ہے، جو اس وقت مستقل رسالہ کی صورت مین الناظر بک ایجنسی [illegible] نے اپنے [illegible] سے شایع ہو رہا ہے۔

محمد سعید [illegible] قوم کے اُن ہونہار نوجوانون مین ہین، جنکے مستقبل سے بہترین توقعات قایم [illegible] وہ صحیح معنے مین "طالب علم" ہین اور اُن کے ذوق ادب کی شہادت اگلے صفحات مین ملیگی جس وقت اُنھون نے یہ مضمون تحریر کیا ہے، وہ جامعہ ملیہ علی گڈھ مین زیر تعلیم تھے۔ اس کم سنی مین، اور تکمیل تعلیم سے قبل، اس پایہ کا مضمون لکھنا ہر اعتبار سے قابل داد، اور ہر پہلو سے مستحق تحسین ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ مجلس انتخاب نے

انعام کا فیصلہ انھین کے حق مین صادر کیا۔ اس مضمون کے ذریعہ سے وہ پہلی بار اردو کی تصنیفی دنیا مین روشناس ہو رہے ہین۔ یقین ہے کہ پختہ کار ہو جانے کے بعد بھی انھین اپنی یہ پہلی کوشش حقیر نہ نظر آئیگی۔

جس سنجیدگی کے ساتھ اُنھون نے شبلی کے خصوصیات دکھائے ہین، اور اُن کے حریفون سے اُنکا موازنہ کیا ہے، یہ اُن کا خاص حصہ تھا۔ نومشق مضمون نگارون کے قلم عموماً ایسے ہی موقع پر آکر پھسل جاتے ہین، اور مدح و تحسین مین غلو، یا ہجو و تنقیص مین بے اعتدالی سے صحیح توازن قائم نہین رہنے پاتا۔ الحمدللہ وہ اس دشوار گزار منزل سے پوری سلامتی و احتیاط کے ساتھ گزر گئے ہین۔ مجھے اُن سے جو کچھ گلہ ہے، وہ صرف یہ ہے کہ سید احمد خان کے ساتھ اُنھون نے انصاف نہین برتا۔ عنوان مین بے شبہ اُنکا نام نہ تھا، لیکن موجودہ نثر اردو کے ارتقا مین اُنکے کارنامون کو سرے سے نظر انداز کر جانا کوئی پہلو جواز نہین رکھتا۔

مین خود اس باب مین بالکل "اہل سنت" کا عقیدہ رکھتا ہون۔ میرے نزدیک ان عناصر خمسہ (بہ شمول سید صاحب) مین سے ہر عنصر بجائے خود پوری اہمیت رکھتا ہے، اور اپنے خصوصیات کے لحاظ سے بے نظیر ہے۔ ایک مرتب و منتظم سلسلہ ہے، کسی ایک کڑی کو بھی اگر بیکار یا ناقص قرار دیا جائے، تو سارا سلسلہ درہم و برہم ہوا جاتا ہے۔ مولانا شبلی سب سے آخر مین ہوئے اس لئے قدرۃً اُنکا رنگ سب سے زیادہ شستہ ہے، اور علمی تحریرون کے لئے اب تک ان سے بہتر کوئی نمونہ اردو مین موجود نہین۔

ایک "طالب العلم" کی طرف سے یہ تحفہ اہل ملک کی ضیافت ذوق [illegible] خدا اسے شرف قبول عطا کرے۔ اور اُنکی آئندہ کوششونکو ملک و ملت کے حق مین مفید ثابت کر[illegible] الناظر بھی شکریہ و مبارکباد کا مستحق ہے، جو ایک جدید و ہونہار اہل قلم کو دنیا سے روشناس کر رہا ہے جیسا کہ اس سے پیشتر بھی وہ بعض چھپی ہوئی ہستیون کو منظر عام پر لانے مین کامیاب ہو چکا ہے۔

دریاباد (بارہ بنکی) ۱۵؍ جون ۲۵ء

عبدالماجد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ادب اُردو کے عناصر اربعہ

میں

علامہ شبلی کا درجہ

تمہید | جس طرح حیاتِ انسانی مرکب ہے اربعہ عناصر سے، یعنی آب، باد، آتش، وخاک، اسی طرح ہمارے اردو لٹریچر کی ترکیب اصلی بھی چار بڑے عناصر سے ملکر ہوئی ہے یعنی آزاد، نذیر احمد، حالی، و شبلی۔ انھیں علحدہ کر لو تو اردو ایک قالب بے جان اور ایک نقش [illegible] بے جان رہ جاتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان میں عنصر اعظم کون ہے؟ اسی کا جواب [illegible] مضمون کا مقصد ہے۔ لیکن اصل میں اس سوال کی دو حیثیتیں ہیں (۱) ادبی [illegible]ی۔ ادبی حیثیت یہ کہ سب سے بڑا انشا پرداز کون ہے؟ اور علمی حیثیت یہ کہ کس نے سب سے زیادہ اردو کی خدمت کی؟ سب سے پہلے ہم سوال کے حصہ اول کو لیتے ہیں۔

اردو انشا پردازی کے اَدوار | یہ ایک بحث طلب امر ہے کہ آیا مصنف اپنے ماحول کا پابند

ہوتا ہے یا ماحول کو وہ اپنا پابند بنا لیتا ہے ؟ تاریخ جہاں ایسے مصنفین کی فہرست پیش کرتی ہے جو اپنے گرد و پیش کے اثرات کا شکار رہوئے، وہاں اس کے اوراق میں ایسے نام بھی نظر آتے ہیں جنھوں نے ماحول سے نکلکر مستقبل پر بھی بہت کچھ اثر ڈالا۔ ہمارے یہ مشاہیر اردو بھی اس قانون فطرت سے باہر نہیں ۔ اس بنا پر مذکورہ بالا مصنفین کی تصانیف کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے زمانہ کی لسانی و ادبی تغیرات کی تصویر ہے اور ہر ایک اپنا اپنا جدا رنگ رکھتا ہے۔ اگرچہ تاریخ میں بعض وقت زمانہ یا دور کی تقسیم ایک خود اختیاری فعل سمجھا جاتا ہے لیکن ایسا کرنا ضروری بھی ہوتا ہے۔ اس بنا پر ان مصنفین کی انشا پردازی کے چار مختلف دور نظر آتے ہیں۔

پہلا دور | ادب اردو کی نشو و نما کا زمانہ وہ تھا جبکہ مغلیہ سلطنت کا چراغ سحری گل ہو چکا تھا اور حکومت انگریزی کا آفتاب افق مشرق سے طلوع ہوکر سارے ہندوستان پر چمک رہا تھا۔ اسلامی حکومت کے ساتھ اسلامی زبان و علوم بھی رخصت ہو چکے تھے لیکن چلتے چلتے اپنی بہت کچھ یادگار چھوڑ گئے۔ اردو زبان کے لئے یہ بڑا نازک وقت تھا۔ اس کے مصنفین پر یہ دشوار گزار فرض عاید ہوا کہ اسلاف کے اس ترکہ میں سے صرف وہی سامان لیں جو قابل قبول اور ضروری ہوں۔ انگریزی زبان کے مصنفین آج تک اس امر کے برابر کوشاں ہیں کہ اپنی زبان سے یونانی، [illegible] جرمن اور فرانسیسی زبانوں کے اثرات اگر یکسر مٹا نہ سکیں تو حتی ال[illegible]لم سے کم کردیں۔ اس عہد اسلامی میں تعلیم و تعلم، درس و تدری[illegible] شاعری سب کام فارسی یا عربی میں ہوتے تھے۔ فارسی، حکومت وقت کی زبان تھی اور عربی مسلمانوں کی مذہبی زبان سمجھی جاتی تھی۔ علاوہ ان کے سنسکرت، بھاشا اور دوسری پراکرت زبانیں بھی ہندوستان میں پہلے سے موجود تھیں جب اردو نے

ان زبانوں کی جگہ لینی چاہی، تو اسوقت یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا لے اور کیا نہ لے۔
پروفیسر آزاد جنھیں ان عناصر اربعہ میں اولیت کا شرف حاصل ہے، اپنے زمانہ کے
ان اثرات کا بیّن نمونہ ہیں۔ ان کی تحریروں میں فارسی و عربی الفاظ کے علاوہ کثرت سے
تشبیہات و استعارے ملتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ تشبیہ و استعارہ کا استعمال متقدین
شعرائے فارسی کے ہاں بھی تھا لیکن متاخرین نے نہ تو ان میں کوئی جدت پیدا کی اور
نہ اعتدال کو ملحوظ رکھا اور انھی کی تقلید کورانہ ہمارے اردو شعرا و مصنفین نے کی جس کا
نتیجہ یہ ہوا کہ وہی شے جو قدما کے رخ کلام کا خال تھا، اردو انشاپردازی کے چہرہ پر
بدنما مسّہ معلوم ہونے لگا۔ پروفیسر آزاد کی ہر بات تشبیہ و استعارہ میں ہوتی ہے اور
وہ بھی اکثر غیر مشبہ تشبیہوں اور مستعار استعاروں میں۔ ایک دوسرا اثر جو ان کی تحریر سے
نمایاں ہے، وہ ہندی اور بھاشا کا ہے۔ ہر چند کہ یہ یہاں کی اصلی زبانیں تھیں لیکن
ان سے وہی افعال و اسما لینا چاہیئے تھا جو فارسی و عربی کے ساتھ کھپ سکتے۔
انشاپرداز یا شاعر کا ایک بڑا کمال یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ جس زبان اور طرز ادا میں
اپنے خیالات کا اظہار کرے، وہ زبان اور طرز ادا زیادہ سے زیادہ عرصہ تک قایم رہنے
والی ہوں۔ سعدی اور حافظ کو آج تقریباً چھ سو برس کا عرصہ گزر گیا لیکن ان کی
زبان آج بھی ویسی ہی تر و تازہ اور باکیف معلوم ہوتی ہے، جیسی ان کے زمانہ میں
تھی۔ ان [illegible] کا آج بھی ہر لفظ فارسی دانوں میں ویسا ہی گوش آشنا اور
متعارف ہے [illegible] بیشتر تھا۔ پروفیسر آزاد کی وفات کو ابھی صرف ۲۴ برس
گزرے ہیں لیکن ان کی زبان میں ایک طرح کی اجنبیت اور مغایرت کی جھلک
نظر آتی ہے اور یہ کیفیت جتنا ہی پیچھے ہٹتے جایئے اسی قدر زیادہ محسوس ہوتی جاتی ہے
ان کی تحریر کے بیسیوں الفاظ آج متروک ہو چکے ہیں، سیکڑوں تشبیہیں اور استعارے
ایسے ملیں گے جن کا آج استعمال کرنا ذوق سلیم کو غالباً پسند نہ ہوگا۔ طرز ادا میں

ایک طرح کی کھنگی اور دریدہ پن نظر آتا ہے۔ یہ تمام باتیں بدرجہ غایت ایک تحریر میں پیش کرنا تو ناممکن ہے لیکن ان کا عام انداز بیان ظاہر کرنے کے لئے دربار اکبری سے یہ ٹکڑہ ملاحظہ ہو۔

"غرض رات نے صبح کی کروٹ لی، ستارہ نے آنکھ ماری، اور شفق خونی پیالہ بھر کر مشرق سے نمودار ہوئی۔ نور کے تڑکے بادشاہی فوج کا ایک آدمی ان کے خیمے کے پیچھے جاکر بہ آواز بلند چلایا کہ مستو! بے خبرو! کچھ خبر بھی ہے؟ بادشاہ خود لشکر سمیت آن پہونچے اور دریا بھی اتر لیے۔ اس وقت خان زماں کے کان کھڑے ہوئے۔ مگر جانا کہ آصف خاں کی چالاکی ہے۔ مجنوں خاں قاقشال کو پھونس بتا بھی نہ سمجھتا تھا۔ کچھ پروانہ کی" (دربار اکبری، صفحہ ۲۳)

دوسرا دور | اردو انشاپردازی کا دوسرا دور ڈپٹی نذیر احمد سے شروع ہوتا ہے جنھوں نے خالص اردو لکھنے کی کوشش کی۔ ان کا وطن اگرچہ بجنور تھا لیکن قیام زیادہ تر دلی میں رہا اس لئے انھیں ٹکسالی زبان لکھنے کا اچھا موقع حاصل تھا۔ ان کی تمام تر کوشش یہ تھی کہ ہر واقعہ اور ہر خیال عام فہم طریقہ پیرا اور سہل زبان میں ادا کیا جائے چنانچہ اسی لئے وہ بالکل ٹھیٹھ اور عامیانہ الفاظ و محاورے استعمال کرتے ہیں۔ تشبیہات و استعارے ان کے ہاں کم ہیں اور جو ہیں وہ زیادہ تر دیسی لیکن اس کوشش میں وہ غالباً اس حقیقت کو نظر انداز کر گئے کہ عام بول چال اور ہوتی ہے اور تصنیفی زبان کچھ اور۔ بدقسمتی سے ادبی اور [illegible] ہر زمانہ اور ہر ملک میں رہے ہیں اور اس بنا پر دو نو طبقوں [illegible] مختلف رہی ہیں۔ انگریزی زبان میں لندن کو وہی درجہ حاصل ہے جو اردو [illegible] کو۔ لیکن انگلستان میں باوجود تعلیم عام ہونے کے لندن کے بازاروں میں جو زبان بولی جاتی ہے وہ علمی طبقہ کی زبان سے بالکل جدا گانہ ہے۔ کوئی انگریزی زبان کا مصنف اگر لندن کی بازاری زبان لکھنے کی کوشش کرتا ہے، یا بھولے سے کوئی لفظ یا محاورہ

استعمال کرلیتا ہے، تو نقادانِ زبان کی زد سے وہ کسی طرح بچ نہیں سکتا۔ ڈپٹی صاحب بھی روزمرہ اور ٹکسالی زبان لکھنے کے جوش میں ایسی زبان لکھ گئے ہیں، جو دلی کے بعض مخصوص محلوں اور کوچوں میں بولی جاتی ہے۔ روزمرہ لکھنا ہر چند کہ مقبول اور پسندیدہ خیال کیا جاتا ہے لیکن وہ نہ اس قدر محدود اور ادنیٰ طبقہ کی زبان ہو کہ اس سے باہر دوسرے حلقوں میں سمجھی نہ جاسکے اور اس کے سیکھنے کے لئے انھیں دور دراز مسافت طے کرکے اس مخصوص علاقہ میں آنا پڑے۔ خود ڈپٹی صاحب نے اس خامی کو محسوس کیا اور لغات مروجہ پر اکتفا نہ کرکے انہیں اپنے ترجمۂ قرآن میں اپنے مخصوص استعمال کردہ الفاظ و محاوروں کی ایک طویل جدید فرہنگ لگانی پڑی۔

جیساکہ اوپر ذکر ہوا، ہر قوم میں روزانہ بول چال کی زبان اور ہوتی ہے اور علمی یا تصنیفی زبان اور۔ جہاں تک ڈپٹی صاحب کے (افسانوں اور ناولوں) کا تعلق ہے، ممکن ہے کہ ان کی زبان زیادہ ناگوار نہ ہو لیکن اس امر پر اتفاق ہونا ممکن نہیں کہ یہ زبان سنجیدہ علمی مضامین، یا مقدس مذہبی خیالات کی بھی متحمل ہوسکتی ہے۔ ڈپٹی صاحب نے بعض آیات قرآنی کے ترجمہ کرنے میں ایسے رکیک اور سخیف الفاظ استعمال کئے ہیں جنھیں سنکر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

آسان اور عام فہم زبان لکھنی اگرچہ ڈپٹی صاحب کی خصوصیت نمایاں ہے لیکن خود [illegible] نے ایک [illegible] کے جید عالم تھے۔ زمانہ طالب علمی سے عربی زبان و ادب سے خاص ذوق [illegible] عربی کے اثر نے ساتھ نہ چھوڑا۔ دلی کی زبان لکھنے بیٹھے ہیں لیکن عربی کے [illegible] وف اور مشکل الفاظ بھی جا بجا لکھتے جاتے ہیں۔ کہیں کہیں مفرد کی بجائے مرکب اور وہ بھی تین چار مفردات سے مرکب الفاظ استعمال کر جاتے ہیں عربی اقوال اور ضرب الامثال کی آمد بھی کچھ کم نہیں۔ قرآن کی آیات بھی گاہ گاہے آجاتی ہیں۔ یہ ہے وہ اجتماع اضداد جسے ڈپٹی صاحب باوجود کوشش کے نہ نبھا سکے اور یہ بیجوڑ مرکب

نہ تو اُن کے ادب لطیف کے لئے پورے طور پر راس آیا، اور نہ مذہبی لٹریچر ہی کے لئے۔ ان کے انداز بیان کا ہر پہلو تو یہاں پر دکھانا ممکن نہیں لیکن ان کی تحریر کا عام رنگ اس عبارت سے معلوم ہو جائے گا۔ اپنی مشہور کتاب توبۃ النصوح کی ابتداء وہ اس طرح کرتے ہیں:۔

"اب سے دو ایک سال پہلے دہلی میں ہیضے کا اتنا زور رہا کہ ایک حکیم بقا کے کوچہ سے ہر روز تیس تیس چالیس چالیس آدمی تت بھنے لگے۔ ایک بازار موت تو البتہ گرم تھا ورنہ جدھر جاؤ سناٹا اور ویرانی، جس طرف نگاہ کرو دہشت و پریشانی، جن بازاروں میں آدھی آدھی رات کھوے سے کھوا چھلتا تھا، ایسے اجڑے پڑے ہیں کہ دن دوپہر جاتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہے کٹوروں کی جھنکار موقوف سودے والوں کی پکار بند، ملنا جلنا (اختلاط و ملاقات، آمد و شد) بیمار پرسی و عیادت (بازدید و زیارت) مہمانداری و ضیافت کل رسمیں لوگوں نے اٹھا دیں۔ ہر شخص اپنی حالت میں مبتلا، مصیبت میں گرفتار، زندگی سے مایوس، کتنے کو زندہ پر مردے سے بدتر، نہ دل میں ہمت نہ پاؤں میں سکت، یا تو گھر انٹوانٹی کھٹوانٹی لیکر پڑ رہا یا کسی بیمار کی تیمارداری کی یا کسی عزیز آشنا کا مرنا یاد کر کے کچھ رو پیٹ لیا (مرگ مفاجات) انہی دنوں کی موت تھی۔ نہ نشان نہ گمان، اچھے خاصے چلتے پھرتے یکا یک طبیعت نے مالش کی۔ پہلی ہی کلی میں (حواس خمسہ مختل) ہو گئے (الا ما شاء اللہ) کوئی جزئی بچ گیا تو بچ گیا، ورنہ جی کا متلانا اور قضا سے سر پر کا آ جانا" (توبۃ النصوح صفحہ ۲)

تیسرا دَور | مولینا حالی کے پیش نظر ایک طرف پروفیسر آزاد [illegible] تھی جو تشبیہات و استعاروں سے پُر، دوسری جانب ڈپٹی نذیر احمد کی زبان جو [illegible] عربی اثرات کے ساتھ ساتھ دلی کے ٹھیٹھ الفاظ و محاورات سے مملو تھی۔ مولینا حالی نے ان کی ترکیب باہمی سے ایک نئی زبان پیدا کرنی چاہی جو دونوں طرز تحریر کے حامیوں میں مقبول اور پسند ہوئی۔ ان کی تحریریں اس بات کا صاف پتہ دیتی ہیں کہ اس غرض کو

پورا کرنے کے لئے آزاد کے ہاں سے فارسیت اور عربیت لیگئی ہے اور نذیر احمد سے سادگی
بیان۔ لیکن مولینا نے دونو طرز تحریر کی اصل روح لینے کی بجائے، صرف ان کی ظاہری
خصوصیات کی تقلید کی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ زبان بلا کی پھیکی اور بےمزہ ہوگئی ہے
صفحے کے صفحے پڑھ جایئے، نہ جذبات میں کوئی حرکت اور نہ قلب پر کوئی اثر۔ سر سید
کی لائیف کا پہلا اڈیشن کم و بیش ایکہزار صفحوں کی کتاب ہے، شروع سے اخیر تک
پڑھ جایئے لیکن ایک ٹکڑہ عبارت کا بھی ایسا نظر نہیں آتا جس سے قلب پر رنج
و خوشی، محبت و نفرت، درس و عبرت، کا کوئی اثر طاری ہوتا ہو۔

مولینا حالی کے ادبی شباب کا وہ زمانہ تھا جبکہ انگریزی حکومت کا پورے طور پر
تسلط ہو چکا تھا۔ انگریزی علوم و ادب، تہذیب و تمدن کا ہر طرف چرچا تھا۔ انگریزی
لکھنا، بولنا ایک فخر سمجھا جاتا تھا۔ آزاد کی طرح حالی بھی اپنے اس جدید ماحول کے
اثر سے محفوظ نہ رہ سکے اور اردو میں بلا تامل انگریزی زبان کے الفاظ اور فقرے
استعمال کرنے لگے۔ انھوں نے اچھے خاصے اردو الفاظ کے ہوتے ہوئے انگریزی کے
مفردات و مرکبات استعمال کیئے ہیں لیکن یہاں بھی اسی ظاہری تقلید کا خیال رکھا ہے
انگریزی زبان سے جدید خیالات یا تشبیہات و استعارات کو کسیقدر تصرف کے ساتھ
اردو میں لاتے تو وہی آج اس زبان کے رخ زیبا کے خط و خال بنتے یا بضرورت ایسے
انگریزی الفاظ [illegible] لیے [illegible] تے جن کے ہم معنی الفاظ اردو میں نہ ہوتے تو آج اردو کے ذخیرۂ الفاظ
میں ایک بیش [illegible] اضافہ ہوتا لیکن بدقسمتی سے ظاہری تقلید نے مولینا کی زبان کو بے انتہا
پھیکی، غیر دلچسپ [illegible] بنا دیا ہے ذیل کی عبارت ان کے عام انداز بیان کا ایک نمونہ ہے:

"سر سید اگر گھر کے انتظام اور نون تیل لکڑی کے حساب کتاب کی طرف متوجہ ہوتے تو
وہ تمام ملکی اور قومی اور مذہبی خدمات جو انھوں نے گزشتہ چالیس پچاس برس میں
سرانجام کیں، وہ کون کرتا؟۔ انھوں نے ایسے کاموں کے لئے جو ہندوستان میں

اور خاص کر مسلمانوں میں بالکل نئے تھے اور جن پر خرچ کرنے کی ان کو بالکل عادت نہ تھی؛ دس بارہ لاکھ سے کم وصول نہ کیا ہوگا۔ اگر وہ کفایت شعاری کو کام فرماتے اور اپنی پاکٹ بالکل نہ جھاڑ دیتے تو اوروں کے کیسے میں کیونکر ہاتھ ڈال سکتے تھے۔ اگر وہ اپنے گھر کو مہمان سرا نہ بناتے تو علی گڈھ کا ایک ویران قطعہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیم کا مرکز کیونکر بن سکتا تھا۔ اگر وہ ہزارہا روپے اپنے پاس سے صرف کر کے اطراف ہندوستان میں چندہ کے لئے سفر نہ کرتے بلکہ اپنا سفر خرچ کمیٹی کے ذمے ڈالتے تو مسلمانوں میں جو ہر وقت اعتراض کرنے کا موقع ڈھونڈھتے، کیونکر اپنا وقار قایم رکھ سکتے تھے۔ اگر وہ یورپین طبقہ میں ہائی لالیت نہ رکھتے تو ہندوستان کے ارکان سلطنت کو اپنے کاموں کی طرف کیونکر متوجہ کر سکتے تھے۔" (حیات جاوید، صفحہ ۲۱۴)

چوتھا دور | علامہ شبلی اس سلسلہ کی آخری کڑی ہیں۔ انھوں نے آزاد کی "شاعرانہ اردو"، نذیر احمد کی "سوقیانہ اردو" اور حالی کی "پھیکی اردو" دیکھی۔ خود ایک دوربین نظر اور نقد پسند طبیعت رکھتے تھے۔ معاملہ کی اصل تہ کو پہونچے۔ انھوں نے سوچا کہ آزاد کے تشبیہات و استعارات کی آورد اردو کی قوت برداشت سے باہر ہے۔ نذیر احمد کا عامیانہ طرز بیان اور سوقیت زبان اردوئے معلّٰی کی شان سے پست تر ہے۔ حالی کی بے نمکی اور پھیکا پن انشا پردازی کے حق میں سم قاتل ہے۔ زمانہ کا بھی رنگ دیکھا کہ اب نہ وہ پہلی سی اسلامی حکومت ہو کہ فارسی و [illegible] باقی رہ سکے، اور نہ ہندوستان کا ہر شہر دہلی و لکھنؤ ہو، جہاں کی [illegible] ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہو اور نہ انگریزی راج کے ساتھ انگریزی [illegible] دے رہا ہے کہ انگریزی زبان کا ہر لفظ اور فقرہ قابل قبول ہو سکے، انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ "برادران وطن" ناگری رسم خط کے ساتھ ہندی کی ترویج میں کوشاں ہیں۔ ان تمام زمانی و مکانی دشواریوں کا لحاظ کر کے علامہ شبلی نے وہ طرز ادا اور

زبان اختیار کی جسمیں بہ یک وقت آزاد کی شوخی تحریر، نذیر احمد کی روزمرہ اور حالی کی سادگی ادا بھی موجود ہو، مگر ہر ایک اعتدال کے ساتھ نہ اس قدر تشبیہات و استعارے کی بھر مار کہ زبان صرف شاعری کے کام کی ہو جاے، نہ اسقدر سوقیت اور عامیانہ پن کہ سنجیدہ اور علمی و مذہبی مضامین کو اس کا جامہ پہننے سے عار آے اور نہ ایسی پھیکی اور بے مزہ کہ سامع پر کوئی اثر یا جذبہ پیدا نہ ہو۔ بلکہ اس زبان کو لیجئے اور اُسے خواہ شاعری سے نازک اور لطیف مضامین کے لئے استعمال کیجیے، خواہ علمی، مذہبی اور فلسفیانہ خیالات کو اسکے ذریعہ ادا کیجیے یا اسے ادب لطیف میں برتئے۔ ہر صنف ادب اور ہر طرز ادا میں قدرے تغیر و تبدل کے ساتھ یکساں طور پر استعمال ہو سکتی ہے۔

ایم۔ مہدی حسن ایک موقع پر تحریر فرماتے ہیں کہ:-

"غالب زندہ ہوتے تو شبلی کو اپنی "اردوے خاص" کی داد دیتی، جس نے ایک نوخیز بازاری یعنی کل کی چھوکری کو جسپر انگلیاں اُٹھتی تھیں، آج اس لایق کر دیا کہ وہ اپنی بڑی بوڑھیوں اور ثقہ بہنوں یعنی دنیا کی علمی زبانوں سے آنکھیں ملا سکتی ہے۔ جوانیوں پر آئی ہوئی نچلی نہیں بیٹھ سکتی تھی، مدتوں شعرا سے گاڑھا اکھاڑا رہا۔ بہ اقتضاے سن بری طرح کھل کھیلی، ہاتھ پاؤں نکالے، اور بہتیرے بنائے بگاڑے کیونکہ ایک زمانہ شیدائی تھا لیکن یہ باتوں ہی میں سب کو ٹالتی رہی۔ بعض جگہ بے آبرو ہونے [illegible] ہو ہو کر رہ گئے اور بال بال بچی۔ آخر آخر میں ملک کے منچلے یعنی ٹولی [illegible] تو یہاں [illegible] پڑے کہ اسکی پردہ دری میں کچھ اٹھا نہیں رکھا تھا۔ کبھی کبھی دبی زبان [illegible] سنا۔ "اری اٹھ جاؤں گی میں صحنک سے"۔ لیکن دفعتاً اسکی حالت نے پلٹا کھایا، کثرت فواحش باعث سنجیدگی ہو گئی۔ اچھے دن آتے ہیں تو بگڑی بن جاتی ہے۔ اب وہ مقدس علما کی کنیزوں میں داخل ہے لیکن سنا گیا ہے خوش اوصاف شبلی سے زیادہ مانوس ہے اور قریب قریب انھی کے تصرف میں رہتی ہے" (افادات مہدی صفحہ ۲۰۱ و ۲۰۲)

شبلی کی "اردوئے خاصہ" کی داد ایک غالب ہی سے کیوں چاہیئے ؟

آج اگر انصاف سے دیکھا جائے تو علامہ شبلی کی اس خدمت کا جو انھوں نے اردو کو حیات جاوید بخشکر کی ہے، ہر شخص معترف ہوگا۔ اردو زبان ان کے اس احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی جنھوں نے اسکو "دنیا کی علمی زبانوں سے آنکھیں ملانے کے" قابل بنایا، جنھوں نے اسکو ملک کے "منچلوں" کی "پردہ دری اور بے آبروئی" سے "بال بال بچایا"، جنھوں نے "کل کی چھوکری" کو "مقدس علما کی کنیزوں" میں داخل ہونے کا شرف بخشا۔ دلی اور لکھنؤ بلبل کی تذکیر و تانیث، "کسو" اور "تلک" کے استعمال و ترک استعمال، دشوار قوافی و ردیف اور سنگلاخ زمینوں میں شعر نکالنے میں مصروف تھے اور ایک پورب کا رہنے والا دلی سے سیکڑوں اور لکھنؤ سے بیسیوں میل دور کا باشندہ اردو کو آب بقا سے سیراب کرنے اور اس کے لئے حیات جاوید کے سامان فراہم کرنے میں سرگرم تھا۔ خوش ہوں اہل دہلی اور اہل لکھنؤ کہ اس نے "ان کی" زبان کو وہ زندگانی بخشی کہ اغیار اس کے مٹانے کی کوشش کریں گے اور وہ نہ مٹ سکیگی، اس نے اسکو وہ مرتبہ بخشا جس پر ہندوستان کی دوسری زبانیں رشک کریں گی، اس نے اسے اس قابل بنایا کہ آیندہ نسلیں اسے اپنے خیالات کے بے تکلف اظہار کا ذریعہ بنائیں گی، اس نے اسمیں قبول عام اور دیرپا قیام کے اجزا کی ایسی ترکیب [illegible] آیندہ "ہند بھاشا" ہونے کا دعویٰ کر سکے گی۔ مولینا شبلی کا [illegible]ن اس طرح کا ہوتا ہے:۔

"دنیا میں جسقدر حکمراں گزرے ہیں ہر ایک کی حکومت کی تہ میں کوئی نہ کوئی مشہور مدبر یا سپہ سالار مخفی تھا، یہاں تک کہ اگر اتفاق سے وہ مدبر یا سپہ سالار نہ رہا تو دفعتہً۔۔۔۔۔۔ فتوحات بھی رک گئیں یا نظام حکومت کا ڈھانچہ بگڑ گیا۔ سکندر ہر موقع پر ارسطو کی

روایتوں کا سہارا لے کر چلتا تھا، اکبر کے پردہ میں ابوالفضل اور ٹوڈرمل کام کرتے تھے،
عباسیہ کی عظمت وشان برامکہ کے دم سے تھی لیکن حضرت عمر کو صرف اپنے دست و بازو کا
بل تھا۔ خالد کی عجیب وغریب معرکہ آرائیوں کو دیکھکر لوگوں کو خیال پیدا ہوگیا تھا
کہ فتح وظفر کی کلید انہی کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن جب حضرت عمر نے ان کو معزول کر دیا تو
کسی کو احساس تک نہ ہوا کہ کل سے کونسا پرزہ نکل گیا ہے؟۔ سعد وقاص فاتح ایرانکی
نسبت بھی لوگوں کو اسی قسم کا وہم پیدا ہو چلا تھا، وہ بھی الگ کر دیے گئے اور
کسی کے کان پر جوں بھی نہ چلی۔ یہ سچ ہے کہ حضرت عمر خود سارا کام نہیں کرتے تھے
اور نہ کر سکتے تھے لیکن جن لوگوں سے کام لیتے تھے، ان میں سے کسی کے پابند نہ تھے۔
وہ حکومت کی کل کو اس طرح چلاتے تھے کہ جس پرزے کو جہاں سے چاہا نکال لیا اور
جہاں چاہا لگا دیا، مصلحت ہوئی تو کسی پرزے کو سرے سے نکال دیا اور ضرورت ہوئی
تو نئے پرزے تیار کر لئے۔" ("الفاروق" صفحہ ۲۲۴ و ۲۲۵)

یہاں تک جو کچھ بیان کیا گیا وہ ان مصنفین کی انشا پردازی پر ایک اجمالی
ریویو تھا اور ہر ایک کی تحریر کا ایسا نمونہ پیش کیا گیا جس سے اس کے عام انداز بیان
کا پتہ چلتا ہو۔ لیکن اس امر کے تصفیہ کے لئے کہ ان میں سب سے بڑا انشا پرداز کون ہے؟
ضرورت اسکی ہے کہ سب سے پہلے انشا پردازی کا ایک معیار قایم کیا جائے اور
اسکی ضرو[illegible] ایسی [illegible]ات بیان کی جائیں، پھر دیکھا جائے کہ کون اس معیار پر پورا
اترتا ہے؟ اور [illegible] یہ [illegible]صیات پائی جاتی ہیں اور کہاں تک؟۔
انشا پردازی کی تعر[illegible] سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ انشا پردازی کسے کہتے ہیں؟
اگر یہ صرف مافی الضمیر کے اظہار کا نام ہے تو اس میں حیوان و انسان دونو برابر ہیں۔
فرق اتنا ہے کہ اول الذکر اکثر اعضا کے اشارات سے اپنے اندرونی جذبات کا
اظہار کرتا ہے یا کبھی اپنی مخصوص بولی ہیں۔ اور انسان کے جذبات ولی موضوع

الفاظ کے لباس میں ظاہر ہوتے ہیں۔ مثلاً کتے کو جب اس کا مالک پیار کرتا ہے تو وہ محبت سے دُم ہلانے لگتا ہے۔ یا بلی جب بھوکی ہوتی ہے تو مسکینت بھری آواز سے "میاؤں میاؤں" کرنے لگتی ہے لیکن انسان جذبۂ محبت یا خواہش گرسنگی کے اظہار کے لئے موضوع کلمات زبان سے نکالتا ہے۔ چنانچہ اسی وصف کو جو حیوان و انسان کے درمیان مابہ الامتیاز ہے، عربی میں "نطق" کہتے ہیں۔ اسی بنا پر انسان کو "حیوان ناطق" کہا جاتا ہے۔ لیکن اگر نطق ہی کا نام انشاپردازی ہے تو یوں بولنے کو جاہل و عالم، دیہاتی و شہری سب بولتے ہیں مگر ہر ایک محض انشاپرداز نہیں سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً فرض کرو کہ ایک دریا طغیانی پر ہے، ایک دیہاتی اسکو پار کر کے اپنے گاؤں کو جاتا ہے گھر پہنچکر وہ اپنے بیوی بچوں میں راستہ کی سرگزشت کا جس معمولی طریقہ پر ذکر کرے گا اُسے انشاپردازی نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اسی واقعہ کو جب کوئی بڑا انشاپرداز بیان کرے گا تو وہ پانی کے تلاطم، کشتیوں کے تھپیڑے کھانے، کھڑی فصلوں کے تہِ آب ہونے اور جل تھل سب ایک ہو جانے کو جس موثر طریقہ پر بیان کرے گا، اس سے سننے والے یا پڑھنے والے پر خوف و رنج اور حیرت و استعجاب کا ایک اثر طاری ہو جائیگا۔ دور کیوں جایئے، اصل لفظ کے معنی پر غور کیجیے۔ "نَشَا" کے لغوی معنی اُبھرنے ابھارنے، یا بلندی و ترفع، کے ہیں، چنانچہ "نُشَا" کے لغوی معنی میں یہ مفہوم پایا جاتا ہے اور مجازی معنی شعر کہنے یا خط [illegible] کے ہیں اور وہ اسی بنا پر کہ شاعر یا خطیب ایک تو خود مشتعل جذ[illegible] ہوتا ہے، دوسرے وہ اپنے کلام یا بیان کے زور سے اوروں کے جذبات ابھار[illegible]تا رہتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ لفظ جذبات انگیز نثر نگاری کے لئے بولا جانے لگا۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص بہت بڑا "منشی" ہے یعنی اعلیٰ درجہ کا لکھنے والا ہے (گو اب یہ لفظ گر کر عرف عام میں محرر یا کلرک کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔)

خطابت، شاعری، و انشاپردازی کا فرق مذکورہ بالا تشریح کے مطابق جب انشاپردازی کی غرض اصلی اثرریزی اور جذبہ انگیزی ٹھیری تو پھر خطابت، شاعری اور انشاپردازی میں فرق ہی کیا رہا؟ (یہاں پر فنون لطیفہ کی صرف ان اصناف سے بحث ہے، جو الفاظ کی شکل میں بذریعہ تقریر یا تحریر ظاہر ہوتی ہیں۔ اس بنا پر مصوری، صنعتگری ونقاشی وغیرہ ہمارے دائرہ بحث سے خارج ہیں) - خطابت میں زیادہ تر فوری جوش واثر کا پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے، کوئی اتفاقی واقعہ پیش آیا اور اس کے لئے سامعین کے جذبات کو تھوڑی دیر کیلئے مشتعل کر دیا گیا لیکن جیسا ہنگامی اس جوش وخروش کا چڑھاؤ ہوتا ہے، ویسا ہی فوری اسکا اتار بھی - مدوجزر کی طرح ان جذبات کو کوئی قیام نہیں ہوتا۔ اس وقتی اثرریزی کے لئے خطیب کو قریبی گرد وپیش کی اشیا سے ہی کام لینا پڑتا ہے، تشبیہ واستعارہ یا مثل وحکایت کے لئے اسے بعید از قیاس یا دیر فہم چیزوں سے کام لینا مناسب نہیں رکیونکہ سامعین کے جذب توجہ یا غور وفکر میں ذراسی تاخیر بھی خطیب کی تمام محنت کو رائیگاں کر دیگی -
مثلاً ایک مقرر اپنے مخاطبین کو قتل وخونریزی کی یاد دلانا چاہتا ہے تو وہ بجائے اس کے کہ میدان کربلا کا نقشہ کھینچے یا کسی خونریز جنگ کے واقعات بیان کرے اس کا صرف یہ کہ [illegible] کافی ہوگا "مجھے تم میں سے کتنوں کے سر تن سے جدا نظر آتے ہیں؟ کتنو[illegible] پر تڑپتی دکھائی دے رہی ہیں!" یا مثلاً وہ سامعین کو صلح جوئی اور ا[illegible] تلقین کرنی چاہتا ہے تو بجائے اس کے کہ وہ فلسفۂ امن وصلح بیان کرے، وہ ہاتھ سے اشارے کر کر کے یہ کہتا ہے کہ "تم جس غرض سے آج اس چھت کے نیچے جمع ہوئے ہو، کیا سمجھتے ہو کہ اس چپہ زمین سے ایک رائی برابر امن بھی اپنے دامن میں (دامن کو ہاتھ سے پکڑ کر) لیکر اٹھو گے؟" غرض خطابت کی جوش انگیزی اور اثرریزی صرف وقتی اور ہنگامی ہوتی ہے۔ یہ جوش

وخروش نہ اس سے زیادہ ٹھہرتا ہو اور نہ زیادہ ٹھہرنے کی ضرورت ہوتی ہو۔

شاعری کا مفہوم عام طور پر کلام موزوں سمجھا جاتا ہو یعنی کلام میں ایک طرح کا وزن پایا جائے۔ آگے چلکر قوافی و ردیف کی شرط بھی آ جاتی ہو۔ لیکن بعض محققین کے نزدیک شاعری نام ہے تخئیل کا۔ یعنی ایسا کلام جسے شاعر کی قوت تخئیل نے نہایت لطیف اور پر اثر طریقہ پر ادا کیا ہو۔ ایک دوسرے گروہ کا خیال ہو کہ شاعری ایک طرح کی محاکات ہو اور وہ محاکات کے دائرہ کو اسقدر وسعت دیتا ہو کہ تخئیل اس سے باہر نہیں جا سکتی۔ اس گروہ کے نزدیک واقعات زمانہ یا مناظر قدرت کا نقشہ اس طرح پر پیش کیا جائے کہ کلام کے سننے والے پر وہی اثر طاری ہو جو ان واقعات و مناظر کو خود دیکھنے سے ہوتا۔ معنی کے لحاظ سے اگرچہ موخر الذکر دونو گروہ پہلے گروہ سے مختلف ہیں لیکن کلام میں وزن ہونے سے انھیں بھی انکار نہیں۔ یہ اسکو شاعری کا ایک جزو سمجھتے ہیں گو اول الذکر گروہ کی طرح اسی کو اصل شاعری نہیں قرار دیتے۔ ایک اور خاص فرق جو خطابت اور شاعری میں ہے، وہ یہ کہ شاعر کو اپنے مخاطب یا سامع سے کوئی غرض نہیں۔ وہ جن جذبات سے خود متاثر ہوتا ہو، یا جو واقعات اسکی نظر سے گزرتے ہیں، ان جذبات و واقعات کو ظاہر کر دینا اسکی غرض اصلی ہے لیکن اس طریقہ پر کہ کوئی شخص جب پڑھے یا سنے تو وہ بھی انہی جذبات سے متاثر ہو۔ شاعری کی ظاہری حیثیت سے ایک خا[illegible] جو اسمیں ہو وہ کسی میں نہیں۔ یعنی کلام میں وزن کے التزام اور [illegible] پابندی سے ضروری و مناسب الفاظ کی آمد ہر موقع پر ممکن نہیں ہوتی [illegible] اس قید اور پابندی کی وجہ سے یہ کلام ہر شخص اور ہر وقت کے لئے مناسب اور ممکن ہو سکتا ہو۔ دوسرے، معنوی لحاظ سے شاعری میں صحت واقعات اور اظہار حقیقت کی شرط کوئی لازمی امر نہیں۔ ممکن ہو اور بہت ممکن ہو کہ اظہار جذبات کے جوش اور

تخئیل کی بلند پروازی میں صحتِ واقعہ اور حقیقت امر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے۔
ان دونوں کے برعکس انشاپردازی کی غرض و غایت کچھ اور ہے۔ اس کا مقصد خطابت کی طرح نہ تو فوری جوش و خروش کا ابھارنا ہنگامی اثر پیدا کرنا ہوتا ہے اور نہ شاعری کی طرح اظہار جذبات یا خیال آرائی ہوتا ہے۔ بلکہ وہ ایک مستقل بالذات شے ہے۔ اس کا مخاطب نہ تو کوئی انسانی مجمع ہوتا ہے اور نہ وہ تمام تر متکلم ہی سے متعلق ہوتی ہے۔ وہ اپنی اثرانگیزی میں ایک خاص ثبات اور مناسبت رکھتی ہے جو نہ بالکل وقتی ہوتی ہے اور نہ ضرورت سے زاید۔ اس کے ہاں نہ تعجیل اثر کا لحاظ ہے جس سے انشا پرداز صرف اپنے گرد و پیش کی چیزوں پر اکتفا کرے، نہ اوزان و قوافی کی قید، جس سے غیر ضروری یا نامناسب الفاظ کی بھرتی کرنی پڑے اور نہ اس کے ہاں تخئیل کی بلند پروازی اور محاکات کی شرط، جس سے صحت واقعات اور اظہار حقیقت کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انشاپردازی اظہار خیالات اور تحریر واقعات کا ایسا ذریعہ ہے جو الفاظ کی بے جا نمائش اور معانی کے مبالغہ و غلو سے پاک ہے۔ اس کے ذریعہ واقعات نہایت سیدھے سادے طریقہ سے ادا کئے گئے ہوں۔ خیالات میں بُعد اور پیچ نہ ہو۔ تشبیہ و استعارہ کی جگہ زیادہ تر نفس واقعہ سے کام لیا گیا ہو۔ غرض یہ ایک ایسا طریقہ ہے جو ہر معمولی شخص کیلیے ممکن الحصول اور قابل عمل ہے۔
الفاظ و معانی [illegible] ایک نہایت لطیف اور دلچسپ بحث یہ آتی ہے کہ آیا انشا پردازی کا دارومدار [illegible] معانی پر۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ انشاپردازی نام ہے بہترین الفاظ کے بہترین طریقہ پر استعمال کا۔ نئے معانی و خیالات ہر روز نہیں پیدا ہوتے۔ ایک ہی خیال ہوتا ہے جو مختلف انشاپرداز مختلف طریقہ پر ادا کرتے ہیں، لیکن ان میں جو فرق ہوتا ہے وہ انتخاب الفاظ اور طرز ادا کا۔ کوئی اسی خیال یا واقعہ کو اس طرح سے بیان کرتا ہے کہ پڑھنے والے پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا،

کسی کا طریقہ بیان اور انتخاب الفاظ ایسا ہوتا ہے کہ پڑھنے سے ایک خاص کیف اور اثر طاری ہونے لگتا ہے۔ انگریزی زبان کے جاننے والے اس نکتہ کو اس مثال سے بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ انگلستان کی تاریخ ہزاروں مصنفین نے لکھی ہے لیکن جو کیفیت اور اثر لارڈ میکالے کی تاریخ کے چند ابواب پڑھکر ہوتا ہے، وہ اور کسی کی تحریر سے نہیں۔

دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ انشا پردازی یا حسن کلام موقوف ہے اعلیٰ معانی اور حسن خیالات پر۔ جبتک معانی میں کوئی ندرت یا خیالات میں کوئی کشش نہ ہوگی نرے الفاظ کا کوئی اثر نہیں۔ تحریر میں اثر اسی وقت ہوتا ہے جب خیالات پر اثر ہوتے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ "آنچہ از دل خیزد بر دل ریزد"۔ دنیا کے اکثر بڑے مصلحین بڑے انشا پرداز بھی مانے جاتے ہیں۔ انگریزی لٹریچر میں زبان کے لحاظ سے انجیل کا جو درجہ ہے، وہ کسی کتاب کا نہیں۔ بعض نقادان فن مہاتما گاندھی کے طرز تحریر کو انگریزی انشا پردازی کا بہترین نمونہ سمجھتے ہیں۔

لیکن ہمارے نزدیک حقیقت یہ ہے کہ الفاظ و معنی کا تعلق جسم و روح کا تعلق ہے جس طرح تنہا روح یا خالی جسم پر زندگی کا اطلاق نہیں ہو سکتا، اسی طرح لفظ کو معنی سے یا معنی کو لفظ سے جدا کرکے انشا پردازی کو باقی نہیں رکھ سکتے۔ اگر الفاظ نہایت شاندار اور پرشکوہ ہیں لیکن بے معنی، ممکن ہے کہ پڑھنے والا بادی النظر میں ان سے متاثر ہو جائے لیکن جہاں ذرا سنبھلا اور خیال معنی کی [illegible] ہوا کہ وہ اثر ایکدم غائب ہو جائیگا۔ انشا پردازی کے متعلق اکثر غل[illegible] [illegible]لم لی ہوئی ہے یہی حال معنی کا ہے۔ خیالات اور معانی خواہ کتنے ہی بلند [illegible] ہوں لیکن ان کے ادا کرنے کے لئے الفاظ ناقص اور غیر موزوں استعمال کئے گئے ہیں تو ان مضامین و خیالات کا کوئی اثر نہ ہوگا۔ دنیا میں کتنے ہی بلند خیالات اور اعلیٰ معانی ظاہر ہوئے لیکن اسوجہ سے مقبولیت اور رواج نہ پاسکے کہ ان کا طریقہ اظہار اور طرز ادا

پسندیدہ اور پُر اثر نہ تھا۔ غرض الفاظ و معانی کا تعلق باہمی لاینفک ہے، اور انشا پردازی ان دونوں کی باہمی اور مشترک خوبی اور موزونیت کا نام ہے، جسکی بہترین مثال ہماری کتاب قرآن حکیم ہے۔

اسی بنا پر علمائے ادب نے انشا پردازی کی دو بڑی جامع اور مانع خصوصیات بیان کی ہیں (۱) فصاحت اور (۲) بلاغت جن میں سے ایک کا تعلق زیادہ تر الفاظ سے ہے اور دوسری کا معانی سے۔ اب ہم ان میں سے ہر خصوصیت اور اس کی جزئیات سے بحث کریں گے اور اسی کے مطابق ان مصنفین کی تحریروں کے نمونے پیش کرتے جائیں گے جس سے یہ واضح ہو جائے گا کہ علامہ شبلی میں یہ خصوصیات کس حد تک پائی جاتی تھیں اور ان کے دوسرے معاصرین میں اس کی کس قدر کمی تھی۔

فصاحت اور اسکی جزئیات

فصاحت میں زیادہ تر کلام یا تحریر کی لفظی حیثیت سے بحث ہوتی ہے۔ یعنی الفاظ اپنی ظاہری حیثیت سے کیسے ہیں؟ بولنے یا سننے میں وہ کیا اثر رکھتے ہیں؟ صرفی قاعدہ سے ان کا کیا درجہ ہے؟ اور تحریر بہ لحاظ مجموعی کیسی ہے؟

فصاحت کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ تحریر کے الفاظ نہایت صاف اور شستہ ہوں۔ صفائی اور شستگی الفاظ سے مراد یہ ہے کہ ان کے بولنے میں زبان کو آسانی ہو اور سننے میں کانوں کو بھلا لگے۔ مثال کے طور پر مولینا شبلی کی یہ چند سطریں ملاحظہ ہوں:

"آج میں نے ایک عجیب دلاویز خواب دیکھا۔ عجیب اس لئے کہ دوپہر کا وقت تھا اور آنکھیں [illegible] کی یہ کیفیت ہے کہ جاگے ہوئے مدت ہو چکی ہے اور اب آنکھوں میں [illegible] رہا ہے۔ مفصل سنئے۔ آج جمعہ کا دن ہے اور معمول کے موافق موکب سلطانی کا نظارہ گاہ تھا، میں بھی ہمہ تن شوق بنکر گیا۔ جامع حمید یہ میں داخل ہوا۔ سلطان المعظم بڑی شوکت و شان سے آئے لیکن میں کچھ نہ دیکھ سکا کیونکہ یہ سیر صرف ان لوگوں کو نصیب ہو سکتی ہے جو گزرگاہ سلطانی پر پہلے سے موجود

ہوتے ہیں اور پھر نماز کے ختم ہونے تک جگہ سے حرکت نہیں کر سکتے۔" (مکاتیب شبلی حصہ اول صفحہ ۱۱۸)

اسی کے برعکس تحریر کا ایک بڑا نقص یہ سمجھا جاتا ہے کہ الفاظ ثقیل اور کریہہ ہوں جن کے بولنے سے زبان پر گرانی اور سننے میں کانوں کو ناگواری محسوس ہوتی ہو۔ بعض وقت تحریر میں دو ایک ثقیل لفظ کا آجانا عبارت کو بے لطف اور بدمزہ کر دیتا ہے۔ دربار اکبری کی چند سطریں بطور مثال پیش ہیں:۔

"ایک سوار علم شاہی لیکر دوڑا اور آواز کی طرح پہاڑ سے پھرا۔ معلوم ہوا کہ محاصرے کو چھوڑ کر اختیار الملک ادھر پلٹا ہے۔ لشکر میں کھلبلی پڑی۔ بادشاہ نے پھر بہادروں کو للکارا۔ نقارچی کے ایسے اوسان گئے کہ نقارہ پر چوٹ لگانے سے بھی رہ گیا۔ یہاں تک کہ اکبر نے خود برچھی کی نوک سے ہشیار کیا۔ غرض سب کو سمیٹا اور پھر فوج کو لیکر دل بڑھاتا ہوا دشمن کی طرف متوجہ ہوا۔ چند سرداروں نے گھوڑے جھپٹائے اور تیراندازی شروع کی۔ اکبر نے پھر آواز دی کہ نہ گھبراؤ۔ کیوں کھنڈے جاتے ہو۔ دلاور بادشاہ شیر مست کی طرح خراماں جاتا تھا اور سب کو دلاسا دیتا جاتا تھا۔ غنیم طوفان کی طرح چڑھا چلا آتا تھا۔ مگر جوں جوں پاس پاس آتا تھا، جمعیت کھنڈی جاتی تھی۔ دور سے ایسا معلوم ہوا کہ اختیار الملک چند رفیقوں کے ساتھ جمعیت سے کٹ کر جدا ہوا ہے اور جنگل کا رخ کیا ہے۔ وہ فی الحقیقت حملہ کرنے نہیں آیا تھا متواتر فتحوں کے سبب سے تمام ہندوستان میں دھاک بندھ گئی تھی کہ اکبر نے تسخیر آفتاب کا عمل پڑھا ہے اب کوئی اس پہ فتح نہ پاسکے گا۔ محمد حسین مرزا کی قید اور تباہی لشکر [illegible] ختیار الملک بے اختیار محاصرہ چھوڑ کر بھاگا تھا۔ تمام لشکر اس کا جیسے جیو [illegible] برابر سے کتر اکر نکل گیا۔ اس کا گھوڑا بگٹٹ چلا جاتا تھا یہ کمبخت بھی تصور میں الجھا اور خود زمین پہ گر پڑا۔" (دربار اکبری صفحہ ۳۳۳۲)

صفائی و شستگی اور ثقل و کراہت کی تمیز تو بہتر طور پر انسان کا لطیف سامعہ ہی

کر سکتا ہے۔ لیکن اس کے لئے کچھ اصول بھی مقرر ہیں۔ مثلاً بعض حروف ایسے ہیں جن کا تلفظ زبان سے آسانی کے ساتھ ہو جاتا ہے اور کانوں کو ان کا سننا بھی بھلا لگتا ہے جیسے بے، تے، رے، زے وغیرہ۔ بعض حروف ایسے ہیں جن کا بولنا اور سننا دونوں ناگوار ہوتا ہے جیسے تے، ڈال، ڑے وغیرہ۔ اسی طرح الفاظ میں بھی ان حرفوں میں سے کسی ایک کے آنے یا ان میں سے دو یا تین کے قریب قریب جمع ہو جانے، یا ایک ہی حرف کے مکرر ہونے سے ثقل و کراہت پیدا ہو جاتی ہے اور اس بنا پر زبان میں شستہ اور لطیف، ثقیل اور کریہہ الفاظ ہو گئے ہیں۔ مکاتیب کی پہلی عبارت میں یوں تو شاید ہی کوئی ثقیل یا کریہہ بتایا جا سکے بلکہ "دلاویز"۔ "سماں"۔ "شوق"۔ "سیر" کے آجانے سے زبان و گوش دونوں کو ایک خاص حظ محسوس ہوتا ہے۔ برعکس اس کے دربار اکبری کی دوسری عبارت میں "کھنڈرے"۔ "چھٹارے"۔ "پھنچوں" اور "بگٹوٹ"۔ "کھنڈی"۔ "تھئور" کے الفاظ سے پڑھنے والے اور سننے والے دونوں کو ایک طرح کی گرانی اور ناگواری معلوم ہوتی ہے۔ علاوہ اس کے بعض جگہ ہائے دوچشمی، چے، اور ڈال کے قریب قریب آجانے سے یا "تھا" پر فقروں کے ختم ہونے سے عبارت میں موسیقیت باقی نہیں رہتی۔

فصاحت کی ایک بڑی خوبی روزمرہ اور بول چال کا استعمال ہے۔ روزمرہ سے مراد وہ زبان ہے جو نہایت سادہ اور عام فہم ہو اور جسے لکھے پڑھے اہل زبان استعمال کرتے ہوں۔ ظاہر ہے کہ ایسی زبان کے الفاظ و محاورات بالکل رائج الوقت ہوں گے۔ علا[illegible] اس نکتہ کو شاید ہی کسی نے سمجھا ہو۔ انھوں نے نہ تو جید اور متبحر [illegible] معرب اردو اور نہ اہل زبان کی بازاری اردو لکھی، بلکہ اہل زبان کے پڑھے لکھے طبقہ کی زبان کو اپنے لئے انتخاب کیا جس کا اندازہ اس ٹکڑہ سے بخوبی ہو سکتا ہے:۔

"مدت سے قدمبوسی نہیں ہوئی اور بہت جی چاہتا ہے۔ میرا تو آنا نہیں ہو سکتا اس لئے

امید کرتا ہوں کہ آپ ہی قدم رنجہ فرمائیں۔ ۱۱۔ دسمبر سے یہاں نہایت عمدہ جلسہ اور سیریں ہوگی اور ۱۹۔ دسمبر تک کالج ایک تماشاگاہ بنا رہیگا۔ پھر بیچ میں وقفہ ہوکر ۲۷۔ دسمبر سے کانفرنس شروع ہوگی۔ بہتر یہ ہے کہ آپ ۱۱۔ تاریخ تک تشریف لائیں۔ بیچ میں دلی اور آگرہ کی سیر بھی ہوسکیگی اور آپ نہایت محظوظ ہوں گے۔" (مکاتیب شبلی حصہ اول۔ صفحہ ۲۲و۲۳)

لیکن بعض وقت روزمرہ کے مفہوم سے ایک بڑا مغالطہ پیدا ہوجاتا ہی، یعنی اکثر سادگی بیان اور سہل زبان کے یہ معنی لئے جاتے ہیں جو سوقیت اور ابتذال کے قریب تر ہوجاتے ہیں۔ خواندہ اور ناخواندہ جبتک یہ دو طبقے کسی سوسائٹی میں موجود ہیں، اسوقت تک ان کی زبانوں میں بھی فرق رہیگا اور اس اختلاف مراتب کی بنا پر ہر دو طبقہ کے مستعمل الفاظ و محاورات اور اقوال و امثال بھی مختلف رہیں گے ایک انشاپرداز کا فرض یہ ہی کہ انتخاب زبان کے وقت اس فرق کو ملحوظ رکھے۔

ہمارے عناصر اربعہ میں اس کے متعلق سب سے بڑی غلط فہمی ڈپٹی نذیر احمد کو ہوئی ہی، جنھوں نے روزمرہ لکھنے کے جوش میں سوقیت کو دخل دیا ہی اور وہ بھی بری طرح۔ توبۃ النصوح میں ایک جگہ لکھتے ہیں:-

"ادھر تو نصوح اور سلیم دونو باپ بیٹوں میں یہ گفتگو ہو رہی تھی، اُدھر اُتنی ہی دیر میں فہمیدہ اور بڑی بیٹی نعیمہ میں خاصی ایک جھوڑ ہوگئی۔ نعیمہ اس وقت دو برس کی بیاہی ہوئی تھی۔ پانچ مہینہ کا پہلونٹی کا لڑکا گ[illegible] بدقسمت میں پلی، نانی کی چہیتی، ماں کی لاڈو، مزاج کچھ تو قدرتی تیز، باپ کے لاڈ پیار سے دہی کھا دستا ہو کریلا اور نیم چڑھا اور بھی چڑچڑا ہوگیا تھا۔ ساس نندوں میں بھلا اس مزاج کی عورت کا کیونکر گزر ہونے لگا تھا۔ گھونگھٹ نکالا تو منہ کھلا اور [illegible] کھلنا تھا کہ سسرال کا آنا جانا بند ہوگیا۔ اب چھ مہینے سے ماں کے گھر بیٹھی ہوئی تھی

مگر رسی جلی پر بل نہ گیا۔ باوجودیکہ اجڑی ہوئی میکے پڑی تھی۔ مزاج میں وہی طنطنہ تھا، کوارپنے ہی میں سوداگر کی زبان تھی۔ کچھ یوں ہی سا لحاظ بڑی بوڑھیوں کا تھا، سو بیاہ سے ان کو بھی دھتکار بتائی۔ بیٹیا جنے پیچھے تو اور بھی کھل کھیلی، مردوں کا لحاظ اٹھا دیا۔ فہمیدہ نے میاں کے روبرو بیٹوں کا بیڑا اٹھاتے تو اٹھا لیا لیکن نعیمہ کے تصور سے بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور جی ہی جی میں کہتی تھی کہ ذرا بھی اس بھڑوں کے چھتے کو چھیڑوں گی تو میرا سر مونڈ کر بھی بس نہ کرے گی۔" (توبۃ النصوح صفحہ ۲۹)۔

یہ ہے اُس زبان کا نمونہ، جو اردو بولنے والی موجودہ اور آیندہ نسلوں کے بولنے اور لکھنے کے لئے پیش کی گئی ہے۔ روزمرہ ہر زبان کے ناول اور افسانوں میں ہوتا ہے مگر وہ اسقدر محدود رقبہ کی زبان نہیں ہوتی جسے دوسری جگہ کے لوگ نہ سمجھ سکیں۔ اس زبان کے بولنے اور سمجھنے کا پورا پورا لطف تو گزشتہ صدی میں دلی کے بعض محلے اور کوچے ہی کے لوگ اٹھا سکتے تھے۔

فصاحت کے سلسلہ میں ایک بڑی نازک بحث سلاست وعدم سلاست کی آتی ہے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ سلاست وروانی بذاتہ کوئی وصف نہیں بلکہ روزانہ کے بول چال اور کثرت استعمال سے تحریر میں سلاست وروانی پیدا ہو جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ کلام مجید کا جب یہ وصف ابوالعلا معری سے (جس نے قرآن کا جواب لکھا تھا) بیان کیا گیا [illegible] ملحد نے جواب دیا کہ "ہاں ابھی نہیں، میرا کلام بھی جب کچھ عرصہ تک نماز و[illegible]رت سے پڑھا جائے، تو اُسمیں بھی وہی سلاست وروانی پیدا ہو جائیگی۔ لیکن اس طرز استدلال میں ایک بہت بڑا دھوکا ہے۔ سلاست وروانی کا دارومدار کثرت استعمال پر ہرگز نہیں بلکہ خود الفاظ، محاورات اور ترکیبوں میں بعض ایسی خصوصیات موجود ہوتی ہیں جن سے تحریر میں سلاست یا اجنبیت پیدا ہو جاتی ہے، مثلاً بعض لفظ میں ایک طرح کی نزاکت و لطافت اور بعض میں

ایک شان و شکوہ پایا جاتا ہے جن کے آنے سے تحریر میں ایک روانی پیدا ہوتی ہے، مگر بعض الفاظ بڑے اور بھونڈے ہوتے ہیں جن سے عبارت میں ایک رکاوٹ اور مغایرت آجاتی ہے ان کی خصوصیات مع مثال کے ذیل میں زیادہ تصریح کے ساتھ آئیں گی۔

تحریر میں عدم سلاست یا مغایرت کی ایک بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اکثر الفاظ و محاورات متروک ہوتے ہیں، یا طریقۂ بیان بدلا ہوا ہوتا ہے، یا بعض وقت اسما و ضمایر کی غیر ضروری تکرار ہوتی ہے۔ ان اسباب سے تحریر میں وہ روانی اور سلاست باقی نہیں رہتی جو ایک مروجہ الفاظ اور غیر متروک انداز بیان کی عبارت میں ہوتی ہے۔ ذیل میں پروفیسر آزاد کی یہ عبارت اسکو واضح کر دیگی۔ لکھتے ہیں کہ۔

"سلیم شاہ کے محلوں میں ایک کشمیرن بی بی تھی، اس سے سلیم شاہ کی ایک بیٹی تھی، وہ خانخاناں کے لشکر کے ساتھ حج کو چلی تھی، وہ خانخاناں کے بیٹے مرزا عبد الرحیم کو بہت چاہتی تھی اور وہ لڑکا بھی اس سے بہت ہلا ہوا تھا اور خانخاناں اپنے فرزند مرزا عبد الرحیم سے لڑکی کی شادی کرنی چاہتا تھا۔ اس بات کا افغانوں کو بہت خار تھا ایک دن شام کے قریب سہس لنگ وہاں کے تلاؤ میں نواڑے پر بیٹھا، پانی پر ہوا کھاتا پھرتا تھا۔ مغرب کے قریب کشتی سے نماز کے لئے اترا" (دربار اکبری صفحہ ۱۹۱)۔

اس مختصر سی عبارت میں اتنے الفاظ مثلاً "ہلا ہوا" "خار" "تلاؤ" "نواڑے" ہیں جن کا استعمال یا تو بالکل ہی ترک ہو گیا ہے، یا بعض [illegible] ستعمال بدل گیا ہے لیکن اس سے بڑھکر طرز بیاں کی اجنبیت ہے۔ دیکھو کہ ابتدائی چاروں جملے ترتیباً "تھی" کے لفظ پر ختم ہوتے ہیں اور بعد کے جملوں میں "تھا" کا التزام ہے۔ اس کے علاوہ بعض الفاظ مثلاً "خانخاناں" "مرزا عبد الرحیم" اور "وہ" کی تکرار سے عبارت میں کسقدر اجنبیت معلوم ہوتی ہے۔ یہ عیب آزاد کی تحریر میں

بہ کثرت پایا جاتا ہے۔ ہزاروں متروک الاستعمال الفاظ و محاورات مثلاً "پٹخ پٹخ کر"۔ "ناک گھسنی کرنا"، "باسن"۔ "چھند پانا"۔ "کھوانا" ان کے ہاں میں سنگے۔
طرزادا میں عام طور پر ایک طرح کی کہنگی اور دیرینہ پن پایا جاتا ہے۔

اسی طرح ڈپٹی نذیر احمد کی تحریر میں اگر ایک طرف عربی کے دقیق لغات ہیں تو دوسری جانب اردو کے ٹھیٹھ الفاظ و محاورات بھی ہیں جن سے کہیں کہیں تحریر کی روانی و سلاست میں فرق آجاتا ہے۔ اول الذکر الفاظ اپنی دشواری کی وجہ سے چل نہ سکے، موخر الذکر اپنی عمومیت کے سبب ترک ہوگئے۔ عربی الفاظ و ضرب الامثال اور آیات قرآنی کے استعمال میں تو ڈپٹی صاحب اپنی کمال عربی دانی اور حافظ قرآن ہونیکی وجہ سے مجبور رہتے جسکی مثالیں طوالت کے اندیشہ سے دینا مناسب نہیں معلوم ہوتا لیکن عامیانہ و سوقیانہ الفاظ کے استعمال کی کثرت تو افراط کی حد کو پہونچ جاتی ہے جنمیں سے بعض الفاظ کا نقل کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ مثلاً "سٹک جانا" "چھپڑ خانی"۔ "پھٹکنا"۔ "لتاڑ"۔ "اکڑ پھول"۔ "کنی کاٹنا"۔ "چیلے چانٹے"۔ "تتو تھمو"۔ "چھدار کھنا" وغیرہ وغیرہ۔ یہ سنکر غالباً اور حیرت ہوگی کہ یہ تمام الفاظ قرآن مجید کے ترجمہ میں استعمال کیئے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض الفاظ تو ایسے ہیں کہ ایک تحریر کیا ایک تصنیف میں آجانے سے نہ صرف اسکی سلاست کو بلکہ اسکی وقعت کو گھٹا دینے کیلئے کافی ہیں۔

مولیٰنا حالی [illegible] جو سیدھی سادی زبان لکھنے کے لیے مشہور رہیں، اس عیب سے پاک [illegible] ہی۔ ان کی تصانیف سے بھی ایک طویل فہرست ایسے الفاظ کی تیار کیجا سکتی ہے جو یا تو دقیق ہونے کے باعث رفتار زبان کا ساتھ نہ دے سکے یا حد سے زیادہ عام فہم ہونیکی وجہ سے زبان کا مذاق لطیف ان کو نہ نبھا سکا۔ عربی کے ایسے دقیق الفاظ مثلاً "منوہ بالشان"۔ "استطرادی"۔ "مطارحات"۔

"محاربت" ، "ماہراکد" کا اردو زبان بولنے والے طبقہ میں رواج پانا دشوار تھا
برعکس اس کے ایسے عامیانہ الفاظ جیسے "تلپٹ" ، "ہرولو" ، "تیکھا پن" ، "ہینجر"
وغیرہ وغیرہ کو قوم کا ادبی مذاق کب گوارا کر سکتا تھا۔

یہاں تک تو عربی فارسی کے دقیق یا ہندی و بھاشا کے ٹھیٹھ الفاظ و محاورات
سے گفتگو تھی جو تحریر میں مانع سلاست و روانی کہے جا سکتے ہیں۔ لیکن اب ایک
تیسرے عنصر سے بحث ہے جو نہ صرف مانع سلاست ہو سکتا ہے بلکہ خود زبان کے
حق میں مضر ہے۔ اس عنصر سے ہماری مراد انگریزی ہے۔ پروفیسر آزاد کے زمانہ
میں عربی و فارسی کا بچا کھچا اثر اسقدر باقی تھا کہ انگریزی کی جو ہندوستان میں
ابھی اپنے عہد طفولیت میں تھی، کچھ پیش نہ گئی اور خیر سے پروفیسر موصوف اس زبان سے
کچھ ایسا واقف بھی نہ تھے۔ لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، انگریزی حکومت کے
ساتھ ساتھ انگریزی زبان بھی اپنا اثر جماتی گئی اور ایسا کیوں نہ کرتی، بادشاہ وقت
کی زبان تھی۔ اسمیں "ہاں" "نہیں" کہنا بڑے فخر کی بات سمجھی جاتی تھی۔ جس کسی کو
انگریزی کی ابجد بھی آتی، وہ عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا یہی اسباب تھے جن کی
بنا پر ہمارے دوسرے اور تیسرے مصنفین (نذیر احمد و حالی) اس انگریزی کا
بے طرح شکار ہوئے۔ ڈپٹی نذیر احمد کو انگریزی ملازمت کے تعلق سے اس زبان کا
سیکھنا ناگزیر تھا چنانچہ انھوں نے اسے بڑے شوق سے سیکھا اور جلد سیکھ لیا۔ یہ اسی
شوق حصول کا اثر ہے کہ انگریزی کا رنگ ان کے ابتدا [illegible] میں بہت زیادہ
نظر آتا ہے خصوصاً لکچروں میں تو صریح آورد معلوم ہو [illegible] ت استعمال کا
یہ حال ہے کہ ان کے درباری لکچر کے صرف ایک صفحہ پر "سپورٹ" (کفالت کرنا)
"ٹالریشن" (رواداری) "ریلیجس نیوٹرلیٹی" (مذہبی غیر جانبداری)۔
"اناکیولیشن" (ٹیکہ)۔ "کوالٹی" (قسم یا صفت)۔ "کوانٹیٹی" (مقدار)

استنے الفاظ آئے ہیں، حالانکہ ان میں سے ہر ایک کیلئے بہتر اردو کا لفظ موجود تھا۔
نہ صرف الفاظ بلکہ انگریزی امثال، فقرے اور مرکبات بھی استعمال کر گئے ہیں مثلاً
"ٹوبی آرناٹ ٹوبی" (To be or not to be)۔ "جیک آف آل ماسٹر آف نن"
(Jack of all master of none) "دی لاسٹ دوناٹ دی لیسٹ" (The last though not the least) "اپ ٹو مارک" (Upto mark) "سینیر ممبر" (Senior member) "ریوینیو بورڈ" (Revenue Board) وغیرہ وغیرہ۔

مولینا حالی بھی اثر کااس سے کچھ کم شکار نہ ہوئے اور یہ عیب ان کی سب سے
بڑی تصنیفات حیات جاوید اور یادگار غالب تک میں پایا جاتا ہے۔ صفحے اُلٹتے
چلے جایئے اور آپ کو انگریزی کے مفرد و مرکب الفاظ ملتے جائیں گے مثلاً "ورکس"
(تصانیف)۔ "امیجینیشن" (تخیل)۔ "میٹریل" (مواد)۔ "رفارمیشن" (اصلاح)
"ججمنٹ" (فیصلہ)۔ "ایشیاٹک پوئٹری" (ایشیائی شاعری)۔ "ڈسپاٹک گورنمنٹ"
(مطلق العنان حکومت) "سلف ریسپکٹ" (خودداری) "پبلک اسپیکنگ" (مجمع عام
میں تقریر کرنا) "ام مورل" (خلاف تہذیب)۔ اس سے زیادہ مضحکہ خیز وہ مرکبات
ہیں جنمیں ایک انگریزی لفظ ہے اور دوسرا اردو۔ مثلاً "کرسچینیٹی سلطنت" (عیسائی
سلطنت) "کریٹکل طریقہ" (ناقدانہ طریقہ)۔ "لٹریری دنیا" (علمی دنیا) وغیرہ۔
قوسین میں دیکھو کہ مذکورہ بالا الفاظ میں سے ہر ایک کا اردو مرادف اُسی زور معنی کے
ساتھ ملسکتا تھا [illegible] مذاق ادبی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ خواہی نخواہی
اس بن بلائے مہمان کو جگہ دیتی۔

حقیقت یہ ہے کہ انشا پرداز کو قوم کا بہت بڑا انباض اور زمانہ کا نبض شناس ہونا چاہیئے
جو سوسائٹی کے میلان طبع اور رفتار زمانہ کے رخ کو پہچان لے۔ اسے معلوم ہو جائے
کہ قوم کا مذاق ادبی کیا ہونیوالا ہے اور زمانہ کس طرف کو لیجارہا ہے۔ علامہ شبلی

اس راز سے بخوبی واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اردو کا خمیر کچھ اور ہی ہے، اسمیں عربی وفارسی کی آمیزش صرف وہیں تک ہونی چاہیئے جہاں تک اس کے اصلی مزہ میں فرق نہ آئے وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ اردو دہلی اور لکھنو تک محدود نہ رہیگی بلکہ اُسے ہندوستان کے طول وعرض میں پھیلنا ہے۔ انگریزی کے اس قبول عام کو دیکھکر انھوں نے اندازہ کیا کہ یہ رنگ جمنے والا نہیں، جسدن ہندوستانی چیتے، یہ رنگ اڑ جائیگا۔ اس لیئے اس زبان سے صرف وہی الفاظ لینے چاہیئں جو ناگزیر ہوں یا جو اپنے ساتھ کوئی مخصوص معنی ومفہوم رکھتے ہوں۔ یہ اسی حقیقت شناسی کا نتیجہ ہی کہ علامہ شبلی کی ابتدائی سے ابتدائی تحریر اُٹھاکر دیکھیئے، اِن عیوب سے بالکل پاک ہوگی۔ سردست جو پرانی سے پرانی تحریر دستیاب ہوسکی ہی، وہ مئی ۱۸۹۷ء کا لکھا ہوا ایک خط ہی جسے انھوں نے نینی تال سے اپنے والد بزرگوار کو بھیجا تھا۔ وہ لکھتے ہیں :۔

"گو میرا قلم، خامۂ نقاش کی ہمسری کرے جس سے میں اس عجیب وغریب مقام (نینی تال) کی پوری تصویر کھینچ سکوں، تاہم مجھکو امید نہیں کہ اس کوشش سے عزیزان وطن کو جو میرے خط پر آنکھ لگائے بیٹھے ہوں گے، اپنے شوق وانتظار کا صلہ ملجائے۔ میں بے تکلف تسلیم کرتا ہوں کہ نینی تال ایک عجیب اور حیرت انگیز مقام ہے لیکن اگر "تعجب انگیز" اور "دلچسپ وفرحت زا" ہونا [illegible] جداگانہ چیزیں ہیں تو مجھ ایسے ایشیائی خیال آدمی سے یہ امید رکھنا عبث [illegible] "فرحت زا" بھی مان لوں گا۔ رہاں جو لوگ انگریزوں کی ہر ادا پر جان دیتے ہیں [illegible] کا مذہب کیا پوچھنا ہے ع ہرچہ آید در دلم غیر تو نیست"

اب حالات سنیئے کارٹ گودام تک ریل ختم ہوتی ہی اور پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہی۔ کارٹ گودام سے نینی تال ۱۲ میل ہے مگر تمام راستہ قدرت الٰہی کی نیرنگی

وعظمت کا مرقع ہے، عرض میں پانچ، چھ ہاتھ زمین چھوٹی ہوئی ہے جس پر رستہ چلتا ہے۔
باقی ایک طرف پہاڑ کی وہ ہیبت ناک دیوار ہو جسکی طرف دیکھنے سے نگاہ کانپ جاتی ہو۔
دوسری جانب نہایت عمیق ہولناک غاروں کا سلسلہ ہے اور اگر اس پہاڑ میں سخت
سردی نہ ہوتی تو یہ غار بڑے بڑے اژدر اور موذی جانوروں کے دار السلطنۃ
ہوتے "... (مکاتیب شبلی حصہ اول صفحہ ۱۰۹)۔

فصاحت میں جہاں تک الفاظ کا انفرادی تعلق تھا گزشتہ صفحات میں اس پر کافی بحث ہو چکی لیکن اب دیکھنا یہ ہو کہ بہ حیثیت مجموعی یعنی عبارت کی صورت میں انشا پردازی کی اس خصوصیت کو کہاں تک دخل ہو؟ اس کے لئے علمائے فن نے دو اصول قرار دیے ہیں ایک تو یہ کہ مضامین اور مثلیں اسقدر عامیانہ اور رکیک نہوں کہ ان سے تنفر پیدا ہو بلکہ نہایت دل پسند اور خوشکن ہوں۔ دوسرے یہ کہ تحریر نہ اتنی طول ہو کہ سنتے سنتے جی گھبرا جائے اور نہ اتنی کوتاہ کہ مطلب خبط ہو جائے۔ اِن دو خصوصیات کے اندازہ کے لئے کوئی آلہ اور پیمانہ تو ہو نہیں سکتا، البتہ صحیح مذاق ہی اس کا بہتر اندازہ کر سکتا ہے۔ مولینا حالی نے "شعر و شاعری" میں جہاں شاعری کی تدریجی رفتار کا ذکر کیا ہو اسکو ایک مثال کے ذریعہ اسطرح واضح کیا ہو۔ وہ لکھتے ہیں:

"اسکی مثال ایسی سمجھنی چاہیئے کہ ایک باورچی نے ایسے مقام پر جہاں لوگ سالم
کچے اور اَن لونے ماش یا مونگ پانی میں بھیگے ہوئے کھاتے تھے۔ انھیں پانی میں
ابال کر اور [illegible] کو کھلایا، انھوں نے اپنی معمولی غذا سے اسی کو بہت
غنیمت سمجھا۔ دوسرے باورچی نے ماش یا مونگ دلوا کر اور دال کو دھو کر اور
مناسب مصالح اور گھی، دال کر کھانا تیار کیا۔ اب تیسرے باورچی کو اگر وہ دال ہی
کے پکانے میں اپنی استادی ظاہر کرنی چاہتا ہو، اس کے سوا اور کوئی موقع تنوع
پیدا کرنے کا باقی نہیں رہا کہ وہ مقدار مناسب سے زیادہ مرچیں اور کھٹائی اور گھی

ڈال کر لوگوں کو اپنی چٹ پٹی ہانڈی پر فریفتہ کرے" (مقدمہ شعر و شاعری، صفحہ ۱۱)

اور پھر اسی کے بعد تین چار مثالیں یکے بعد دیگرے اسی مضمون کو واضح کرنے کیلئے بیان کرتے ہیں لیکن ان میں نہ تو آپسمیں کوئی خاص فرق ہے اور عامیانہ پن اسقدر کہ اِن کے پڑھنے سے طبیعت میں ایک طرح کی بدمزگی پیدا ہوتی ہے لیکن اسی ارتقاء شاعری کے مضمون کو علامہ شبلی صرف ایک مثال سے بیان کرتے ہیں جسے پڑھکر طبیعت سیر ہو جاتی ہے اور جی خوش ہو جاتا ہے۔ انھوں نے شاعری کی رفتار کی مثال ایک قوم کی مادی ترقی سے دی ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:۔

"مثلاً ابتدا میں رہنے سہنے کے لئے پھونس کے جھونپڑے اور خس پوش کچی دیواریں ہوتی ہیں پھر پختہ عمارتیں بنتی ہیں۔ پھر ان میں مختلف حصے، شہ نشین، دالان، صحنچیاں، بالاخانے قایم کئے جاتے ہیں۔ کمرے فرش فروش سے سجاتے ہیں، جھاڑ فانوس دیوار گیریاں لگاتے ہیں تاہم اعتدال سے آگے نہیں بڑھتے۔ پھر سنگ مرمر کی عمارتیں بننی شروع ہوتی ہیں، جواہرات کی پچی کاری ہوتی ہے، دیواروں پر طلائی نقش و نگار بنتے ہیں، اطلس و کمخواب کا فرش بچھتا ہے، دروازوں پر گوہر نگار پردے آویزاں کرتے ہیں، کافوری شمعیں جلاتے ہیں، یہ ترقی کا آخری دور ہے جس کے بعد تنزل شروع ہوتا ہے اور قوم تباہ ہو جاتی ہے" (شعر العجم حصہ ۴، صفحہ ۱۱۷)۔

دوسرے اصول (یعنی تحریر نہ طول ہو نہ کوتاہ) اسکی مثال میں سیرۃ النبی کی ابتدائی چند سطریں پیش کیجا سکتی ہیں جنمیں اتنا وسیع [illegible] تہذیب اخلاق اور تزکیۂ نفوس کے کیا طریقے ہونے چاہیئں نہایت اختصار اور خوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ:۔

"(اس کا) سب سے زیادہ صحیح، سب سے زیادہ کامل، سب سے زیادہ عملی طریقہ یہ ہے کہ نہ زبان سے کچھ کہا جائے، نہ تحریری نقوش پیش کئے جائیں، نہ جبر و زور سے کام لیا جائے

"بلکہ فضایل کا ایک پیکر مجسم سامنے..... آجائے جو خود ہمہ تن آئینہ عمل ہو، جسکی ہر جنبش
لب ہزاروں تصنیفات کا کام دے اور جس کا ایک ایک اشارہ اوامر سلطانی بنجائے۔
دنیا میں آج اخلاق کا جو سرمایہ ہے سب انہی نفوس قدسیہ کا پرتو ہے۔ دیگر اوراسیاسب،
صرف ایوان تمدن کے نقش ونگار ہیں" (سیرۃ النبی حصہ صنف)

اسی مضمون کو اگر پروفیسر آزاد بیان کرتے تو دفتر کا دفتر سیاہ کر ڈالتے۔ زور بیان
پیدا کرنے کے لئے آسماں و زمین کے قلابے ملا دیتے لیکن نہ جانے یہ بات بھی
پیدا ہوتی یا نہیں جو ان چند سطروں میں ہے۔

بلاغت اور اسکی جزئیات | انشا پردازی میں فصاحت کا جہاں تک تعلق تھا، اس کا بیان
ہو چکا، اب اسکی دوسری خصوصیت، بلاغت کا ذکر ہوگا بلاغت کی پہلی شرط یہ ہے کہ
اسمیں فصاحت کی تمام خوبیاں موجود ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی تحریر یا الفاظ
اسوقت تک بلیغ نہیں کہے جا سکتے جبتک وہ فصیح نہ ہوں۔ لیکن بالخصوص بلاغت
کا تعلق الفاظ و تحریر کی معنوی حیثیت سے ہے۔ یعنی جو الفاظ استعمال کئے گئے ہوں
وہ معانی کے لحاظ سے بالکل مناسب اور باموقع ہوں۔ نازک اور لطیف مضامین
کے لئے ویسے الفاظ ہوں اور شاندار و پرشکوہ واقعات کے لئے ویسے۔ اظہار رنج
غم کے لئے درد آمیز اور غمناک اور مسرت وخوشی کے لئے سرور بخش و فرحت زا الفاظ
استعمال کئے گئے ہوں۔ تاکید اور زور پیدا کرنے کے لئے الفاظ موکد اور مکرر ہوں،
غرض جس وا[illegible] کو انشا پرداز ادا کرنا چاہتا ہے، اس کا صحیح صحیح اور
نقشہ آنکھوں کے سامنے مناسب اور موزوں الفاظ کے ذریعہ کھینچ کر رکھ دے۔
[illegible]ن کا ایک بڑا کمال یہ سمجھا جاتا ہے کہ جس سماں کو انشا پرداز پیش کرنا چاہتا ہے
[illegible] لئے ایسے الفاظ اور ایسا طریقہ بیان اختیار کرے جس سے معلوم ہو کہ اس
[illegible]یے وقت وہ خود موجود تھا۔ علامہ شبلی نے سیرت میں جہاں رسم قربانی سے

بحث کی ہو، حضرت اسمٰعیلؑ کے واقعہ ذبح کو اس طرح بیان کیا ہے کہ اردو زبان میں بلاغت کی مثال اس سے بہتر ملنی مشکل ہے۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کی باہمی گفتگو کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"اب ایک طرف نود سالہ پیرِ ضعیف ہو جسکو دعاہائے سحر کے بعد خاندان نبوت کا چشم و چراغ عطا ہوا تھا، جسکو وہ تمام دنیا سے زیادہ محبوب رکھتا تھا۔ اب اسی محبوب کے قتل کیلیے اسکی آستینیں چڑھ چکی ہیں اور ہاتھ میں چھری ہو۔

"دوسری طرف نوجوان بیٹا ہے جس نے بچپن سے آج تک باپ کی محبت آمیز نگاہوں کی گود میں پرورش پائی ہے اور اب باپ ہی کا مہر بر دربات اس کا قاتل نظر آتا ہو۔ ملائکہ قدسی، فضاہائے آسمانی، عالم کائنات یہ حیرت انگیز تماشا دیکھ رہے ہیں اور انگشت بدنداں ہیں کہ دفعتہً عالم قدس سے آواز آتی ہے کہ

یَا اِبْرَاهِیْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْیَا اِنَّا کَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ۵ (صٰفّٰت)

(ابراہیم تونے خواب سچ کر دکھایا۔ ہم نیک بندوں کو اسی طرح اچھا بدلہ دیا کرتے ہیں)

طغیانِ ناز بیں کہ جگر گوشۂ خلیل

در زیر تیغ رفت و شہیدش نمی کنند" (سیرۃ النبی حصہ اصفحہ ۱۱۵)

غور کرو اور دیکھو کہ اس مختصر سی عبارت کے پڑھنے کے بعد جو نقشہ آنکھوں کے سامنے آتا ہو، کیا وہ یہ نہیں ہو کہ ایک ضعیف کہن سال شخص دل مضبوط کر کے ایک کمسن مسکین بچے کے گلے پر چھری پھیرنا ہی چاہتا ہو کہ [illegible] ان سے ایک آواز آتی ہے اور وہ اپنے ارادہ سے باز آجاتا ہو۔

بلاغت کی ایک دوسری خوبی جیسا کہ بیان کیگئی یہ ہو کہ الفاظ مناسب موقع و محل ہوں یعنی جنگ و جدل کے واقعات بیان کرنے کیلیئے شاندار اور پرشکوہ الفاظ لائے جائیں اور حسن و عشق کی داستان کے لیئے نازک اور لطیف الفاظ استعمال کیئے جائیں

یہی فرق ہے جسے اگر ملحوظ نہ رکھا جائے تو کلام یا تحریر کا اثر کما حقہ نہیں ہوتا۔ یہ فرق اردو کے دو بڑے انشا پردازکی تحریروں سے واضح ہو جائیگا۔ علامہ شبلی، "جنگ قادسیہ" کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

"سعد نے یہ دیکھکر کہ ہاتھی جس طرف کا رخ کرتے ہیں، دَل کا دَل پھٹ جاتا ہے۔ ضخم و مسلم وغیرہ کو جو پارسی تھے اور مسلمان ہو گئے تھے، بلاکر پوچھا کہ اس بلائے سیاہ کا کیا علاج ہے؟ انھوں نے کہا کہ ان کی سونڈ اور آنکھیں بیکار کر دی جائیں۔ تمام غول میں دو ہاتھی نہایت مہیب اور کوہ پیکر اور گویا کل ہاتھیوں کے سردار تھے۔ ایک ابیض اور دوسرا اجرب کے نام سے مشہور تھا۔ سعد نے قعقاع، عاصم، حمال، ربیل کو بلاکر کہا کہ یہ مہم تمھارے ہاتھ ہے۔ قعقاع نے پہلے کچھ سوار اور پیادے بھیجدیے کہ ہاتھیوں کو نرغہ میں کرلیں پھر خود برچھا ہاتھ میں لیکر پیل سفید کی طرف بڑھے، عاصم بھی ساتھ تھے، دونوں نے ایکساتھ برچھے مارے کہ آنکھوں میں پیوست ہو گئے۔ ہاتھی جھرجھری لیکر پیچھے ہٹا ساتھ ہی قعقاع کی تلوار پڑی اور سونڈ مستک سے الگ ہو گئی۔ ادھر ربیل و حمال نے اجرب پر حملہ کیا وہ زخم کھاکر بھاگا تو تمام ہاتھی اس کے پیچھے ہوئے اور دَم کی دَم میں یہ سیاہ بادل بالکل چھٹ گیا اب بہادروں کو حوصلہ افزائی کا موقع ملا اور اس زور کا رَن پڑا کہ نعروں کی گونج سے زمین دہل دہل پڑتی تھی"۔ (الفاروق، صفحہ ۹۰)۔

تحریر بالا میں دیکھو کہ مضمون کی مناسبت سے الفاظ کیسے کیسے آئے ہیں مثلاً "دل کا دل"۔ "بلائے سیاہ"، "[illegible] پیکر"۔ "مہم" "سوار و پیادے"۔ "نرغہ"۔ "سیاہ بادل" "رَن"۔ اسی طرح ایک جنگ کے حالات پروفیسر آزاد نے "دربار اکبری" میں بیان کیے وہ تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"عصر کا وقت تھا کہ اکبری شفقت کا دریا چڑھاؤ پر آیا۔ بہت سے بہادر انتخاب کیے کہ کشتیوں پہ سوار ہو کر جائیں اور میدان جنگ کی خبر لائیں۔ قلعہ والوں نے دیکھکر اوپر سے

گولے برسانے شروع کئے اور اٹھارہ کشتیاں ان کے روکنے کو بھیجدیں۔ بیچ منجدھار میں ٹکر ہوئی۔ دیکھ گئے تھے کہ بادشاہ ہمارا دیکھ رہا ہے۔ دریا کے دھوئیں اڑاتے اور آگ برساتے پانی پر سے ہوا کی طرح گزر گئے، حریف دیکھتے ہی رہ گئے۔ پھر بھی چڑھاؤ کی چھاتی توڑ کر جانا کچھ آسان کام نہ تھا اور کمک کو غنیم نے دریا میں روکا ہوا تھا۔ دور ہی سے مقام جنگ پر گولے مارنے شروع کئے۔ ان کے گولوں نے غنیم کی ہمت کا لنگر توڑ دیا اور کشتیاں ہٹانی شروع کیں اب ایک کے ملاح پہلو کاٹ کر چلے۔ اگرچہ قلعہ سے گولے پڑنے شروع ہوئے مگر یہ بھاگا بھاگ ایک موقع کے گھاٹ پر جا پہنچے اور وہاں سے کشتیوں کو چھوڑا کہ تیر کی طرح سیدھی معرکہ جنگ پر آئیں۔ بادشاہی فوج کناروں پر اتری ہوئی تھی اور سینہ سینہ لڑائی ہو رہی تھی۔ افغانی سرداروں نے کوچہ بندی کرکے بھی لڑائی ڈالی مگر تقدیر سے کون لڑ سکے۔ خلاصہ یہ کہ حاجی پور فتح ہو گیا اور بادشاہی فوج قلعے پر قابض ہو گئی" (دربار اکبری صفحہ ۲۴۱، ۲۴۲)۔

اسی کے آگے فتح پٹنہ کا بیان آتا ہے جو اس سے کچھ کم قصہ نما نہیں ہے۔ پھر اس کے بعد بنگالہ فتح کرنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں اور آئندہ کا نقشۂ جنگ مرتب کیا جاتا ہے۔ فن جنگ کے جاننے والے سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کسقدر سنجیدگی طلب اور غور و فکر کا موقع ہوتا ہے لیکن آزاد کا رنگینی پسند قلم یہاں بھی گل و بلبل کی ہمنوائی سے نہیں چوکتا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:-

"خلوت کے چمن میں حکم ہوا کہ مشورت کی بلبلیں آئیں کہ بنگالہ کے لئے کیا اصلاح ہے [illegible] بعض کا زمزمہ ہوا کہ برسات میں ملک مقبوضہ کا بند و بست ہو [illegible] بنگالہ پر خونریزی سے گلزار کا خاکہ ڈالا جائے۔ بعض نے نغمہ سرائی کی کہ [illegible] لینے دو۔ اڑ جائیں اور چھری کٹاری ہو جائیں کہ یہی بہار رہے۔ فتح کے گلچیں اور سلطنت کے باغبان نے کہا کہ ہاں یہی بانگ سچی ہے" (صفحہ ۲۴۲)۔

بلاغت کی ایک اور بڑی خوبی یہ سمجھی جاتی ہے کہ جب ایک ہی معنی کے متعدد

الفاظ ہوں تو اُن میں سے صرف ایسے الفاظ کا انتخاب کر لیا جائے جو معنی کے لحاظ سے وہاں سب سے زیادہ موزوں ہو۔ ورنہ یوں ادائے مطلب کے لیئے تو ہر شخص لکھ لیتا ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ مطالب کا جو ہجوم ایک لفظ میں ہوتا ہے، وہ سطروں میں ادا نہیں ہو سکتا۔ ایک اچھے انشا پرداز کا بڑا وصف یہ بھی ہے کہ انتخاب الفاظ کا صحیح مذاق اسمیں موجود ہو۔ علامہ شبلی کی نقد پسند طبیعت اس نکتہ کو خوب سمجھتی تھی۔ چنانچہ وہ ایک موقع پر شیخ سعدی کے سومنات جانے کے واقعہ کو اسطرح پر لکھتے ہیں کہ:-

"وہ (شیخ سعدی) سومنات آیے، یہاں ایک عظیم الشان بتخانہ تھا۔ پوجاریوں سے راہ و رسم پیدا کی۔ ایکدن ایک برہمن سے کہا کہ مجھکو سخت حیرت ہے کہ ایک پتھر کو لوگ کیوں پوجتے ہیں، وہ نہایت برہم ہوا اور تمام بتخانہ میں چرچا پھیل گیا۔ سب اُن پر ٹوٹ پڑے، اور ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ انھوں نے کہا کہ بت کے ظاہری حسن و خوبی کا میں بھی معترف ہوں لیکن جاننا چاہتا ہوں کہ معنوی کمال کیا ہے! برہمن نے کہا ہاں یہ پوچھنے کی بات ہے۔ میں نے بھی بہت سفر کئے اور ہزاروں بت دیکھے لیکن جو معجزہ اسمیں ہے کسی میں نہیں، یہ ہر روز صبح کو دعا کے لئے خود ہات اُٹھاتا ہے! چنانچہ دوسرے دن شیخ نے یہ شعبدہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ شیخ کو نہایت حیرت ہوئی اور اس فکر میں ہوئے کہ اصل راز کیا ہے؟ تقیۃً بت کے ہاتھ چومے اور بہت خشوع و خضوع ظاہر کیا۔ اور بتخانہ میں اس عقیدت کے ساتھ رہنے لگے جیسے پوجاری مندر میں رہا کرتے [illegible] حصہ ۲ صفحہ ۴۱۔

مندرجہ بالا [illegible] دیکھو کہ جو خاص الفاظ استعمال ہوئے ہیں، انھیں ان کے مرادفات پر کیا وجہِ ترجیح ہے۔ "راہ و رسم" کے ہم معنی اردو میں بہت سے الفاظ ہیں مثلاً 'ملاقات'، 'شناسائی'، 'دوستی'، 'جان پہچان'۔ لیکن ملنے جلنے کی ابتدا کرنے اور آمد و رفت رکھنے کا جو مفہوم "راہ و رسم" میں پایا جاتا ہے، وہ انہیں سے

کسی میں نہیں۔ پھر "پتھر" کے ایک لفظ کہہ دینے سے بت کی شان میں حقارت و مذمت کا جو اظہار ہوتا ہے، اسکے لئے پجاریوں کی برہمی اور ہنگامہ آرائی کافی دلیل ہے۔ اسی مفہوم کو حقارت و مذمت کے لفظ کے ساتھ ایک سطر میں ظاہر کرتے تو اسمیں بلاغت کی وہ شان نہ رہتی۔ آگے چلکر ایک لفظ "معجزہ" کا آیا ہے جو عین اقتضائے حال کے مطابق ہے۔ اس ایک پنج حرفی لفظ میں مذہبی تقدس اور جذبات عقیدت کے جو مفہوم داخل ہیں، ان کو برہمن کی زبان سے ادا کرنے کے لئے اردو میں کوئی دوسرا لفظ ہو نہیں سکتا تھا۔ اسی کے بالمقابل سعدی کی زبان سے بت کے اسی فعل کو "شعبدہ" کے لفظ سے ادا کیا ہے۔ ان دونوں الفاظ میں عقیدت اور عدم عقیدت کا جو فرق پایا جاتا ہے، وہ فن بلاغت کا ایک باریک نکتہ ہے جس کا لحاظ تبلی سا نقاد فن ہی کر سکتا تھا۔ "شعبدہ" کے قریب المعنی الفاظ اور بھی بہت سے تھے مثلاً "کرشمہ"، "ماجرا"، "تماشا" لیکن انمیں سے کسی میں وہ بات نہیں جو شعبدہ کے لفظ میں ہے۔ "چومنا" اور "بوسہ دینا" ان دونوں لفظوں میں بظاہر کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا لیکن اول الذکر سے جس عقیدت و خلوص کا اظہار ہوتا ہے، وہ دوسرے سے اُسقدر نہیں بلکہ اس سے ایک حد تک تکلف و تصنع ٹپکتا ہے اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ ایک خالص اردو کا مفرد لفظ فارسی کے مرکب لفظ پر بہر صورت مرجح تھا۔ بعینہ یہی فرق "پوجنے" اور "پرستش کرنے" کے الفاظ میں بھی ہے جس مذہبی عقیدت اور خلوص کو ظاہر کرنے کیلئے اور الفاظ آئے ہیں، اسی غرض کے لئے "خشوع و خضو[illegible]" [illegible]ال بھی ہے جسکے بغیر لائے ہوئے کسی مذہبی عقیدت و خلوص کے خیال کا [illegible] کہا جا سکتا۔

بالکل اسی واقعہ کو مولینا حالی نے بھی اپنی حیات سعدی میں بیان کیا ہے، ذیل میں ان کی عبارت کو پڑھو اور دیکھو کہ کیا انھوں نے بھی بلاغت کی ان خوبیوں کو ملحوظ رکھا ہے؟ وہ لکھتے ہیں کہ:-

"جب میں (سعدی) سومنات پہنچا اور ہزاروں آدمیوں کو دیکھا کہ ایک بت کی پرستش کیلیے دور دور سے وہاں آتے ہیں اور اس سے مرادیں مانگتے ہیں تو مجھکو تعجب ہوا کہ جاندار ایک بیجان چیز کی کس لئے پرستش کرتے ہیں۔ اس بات کی تحقیق کے لیے میں نے ایک برہمن سے ملاقات پیدا کی۔ ایک روز اس سے پوچھا کہ یہ لوگ اس بے حس مورت پر کیوں اسقدر فریفتہ ہیں؟ اور اس کے سامنے مورت کی سخت مذمت اور حقارت کی۔ برہمن نے مندر کے پجاریوں کو خبر کر دی۔ سب نے مجھکو آن کر گھیر لیا۔ میں نے مصلحتاً اسکے سرگروہ سے کہا کہ میں نے کوئی بات بداعتقادی سے نہیں کی۔ میں خود اس مورت پر فریفتہ ہوں لیکن چونکہ میں نووارد ہوں اور اسرار نہانی سے واقف نہیں ہوں اس لئے اسکی حقیقت دریافت کرنا چاہتا ہوں تاکہ سمجھ بوجھ کر اسکی پوجا کروں۔ اس نے یہ بات پسند کی اور کہا کہ آج رات کو مندر میں رہ تجھکو اصل حقیقت معلوم ہو جائیگی میں رات بھر وہاں رہا۔ صبح کے قریب تمام بستی کے مرد عورت وہاں جمع ہو گئے اور اس مورت نے اپنا ہاتھ اٹھایا جیسے کوئی دعا مانگتا ہے۔ یہ دیکھتے ہی سب جے جے پکارنے لگے۔ جب وہ لوگ چلے گئے تو برہمن نے ہنسکر مجھ سے کہا۔ کیوں اب تو کوئی شبہ باقی نہیں رہا؟ میں ظاہرداری سے رونے لگا اور اپنے سوال پر شرمندگی اور انفعال ظاہر کیا۔ سب برہمنوں نے مجھ پر مہربانی کی اور میرا ہاتھ پکڑ کر اس مورت کے سامنے لے گئے میں نے مورت [illegible] دیا اور بظاہر چند روز کے لئے برہمن بنگیا۔" (حیات سعدی، صفحہ ۳۴ و ۳۵)

ایک اور طریقہ اقوام [illegible] ت اور قابلیت کے اندازہ کرنے کا ایک منصفانہ طریقہ یہ ہی کہ یہ دیکھا جاسے کہ وہ قوم یا اس کے افراد ابھر کر کہاں تک پہونچے؟ اُن کی بلند پروازی کی آخری حد کہاں تک پہنچتی ہی؟ ان کی ترقی کا پارہ زیادہ سے زیادہ کس درجہ پر آتا ہی اور پھر اس کے بعد باہم مقابلہ کر کے دیکھا جائے کہ ان میں کون سب سے آگے ہی؟

اب تک ہم نے انشا پردازی کی تعریف، اسکی غرض اور اسکی دو بڑی خصوصیات

فصاحت و بلاغت مع ان کی جزئیات سے بحث کی ہے اور اُن کے ثبوت میں ہر چہار مصنفین کی تحریروں کے نمونے پیش کئے ہیں جس سے یہ واضح ہو گیا ہوگا کہ علامہ شبلی کا درجہ ان کے دیگر معاصرین انشا پردازوں میں کسقدر بلند ہے! اب ہم اس جدید طریقہ کے مطابق ان مصنفین کی تحریروں کے منتخب اور چیدہ نمونے (جو ان کے اختراع فائقہ (ماسٹر پیس) کہے جا سکتے ہیں) پیش کرتے ہیں اور فیصلہ خود ناظرین کے مذاق ادبی اور انصاف پر چھوڑتے ہیں۔ سب سے پہلے آزاد کو لو، دربار اکبری میں اکبر کے خصائل و عادات بیان کرنے میں انھوں نے اپنے پورے زور قلم سے وہ کام لیا ہے جسکی نظیر ان کی تمام تصانیف میں کہیں دوسری جگہ نہیں ملسکتی۔ وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"اسکی طبیعت کا رنگ ہر عہد میں بدلتا رہا۔ بچپن کی عمر کہ پڑھنے کا وقت تھا کبوتر ونیں اڑایا۔ ذرا ہوش آیا تو کتے دوڑانے لگے۔ اور بڑے ہوئے گھوڑے بھگانے اور باز اڑانے لگے۔ نوجوانی تاج شاہانی لیکر آئی۔ بیرم خاں وزیر صاحب تدبیر ملگیا تھا۔ یہ سیر و شکار، اور شراب و کباب کے مزے لینے لگے لیکن ہر حال میں مذہبی اعتقاد سے دل نورانی تھا۔ بزرگان دین سے اعتقاد رکھتا تھا۔ نیک نیتی اور خدا ترسی بچپن سے مصاحب تھی۔ طلوع جوانی میں آکر کچھ عرصہ تک ایسے پرہیز گار نماز گزار ہوئے کہ کبھی کبھی خود مسجد میں جھاڑ دیتے تھے اور نماز کے لئے آپ اذان کہتے تھے۔ علم سے بے بہرہ رہے مگر مطالب علمی کی تحقیقات اور اہل علم کی صحبت کا شوق اتنا تھا کہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ باوجودیکہ ہمیشہ فوج کشی اور مہموں میں گرفتا[illegible]ی کاروبار کا ہجوم تھا، سواری شکاری بھی برابر جاری تھی۔ مگر وہ علم کا عاشق علم و حکمت کے مباحثوں اور کتابوں کے سننے کا وقت نکال ہی لیتا تھا۔ یہ شوق کسی خاص مذہب یا خاص فن میں محبوس نہ تھا۔ کل علوم اور کل فنون اس کے لئے یکساں تھے۔ ۲۰ برس تک دیوانی فوجداری بلکہ سلطنت کے مقدمات بھی علماے شریعت کے

ہاتھ میں رہے۔ جب دیکھا کہ ان کی بے لیاقتی اور جاہلانہ سینہ زوری ترقی سلطنت میں خلل انداز ہی تو آپ کام کو سنبھالا۔ اس عالم میں جو کچھ کرتا تھا امرائے تجربہ کار اور معاملہ فہم عالموں کی صلاح سے کرتا تھا۔ جب کوئی مہم پیش آتی، یا اثنائے مہم میں کوئی نئی صورت واقع ہوتی یا کوئی انتظامی امر آئین سلطنت میں جاری یا ترمیم ہوتا تو پہلے امرائے دولست کو جمع کرتا، ہر شخص کی رائے کو بے روک سنتا اور سنا تا اور اتفاق رائے اور صلاح و اصلاح کے ساتھ عمل درآمد کرتا" (دربار اکبری، صفحہ ۱۲۹ و ۱۳۰)

ڈپٹی نذیر احمد کی تمام تصانیف میں توبۃ النصوح ان کی سب سے بہترین تصنیف سمجھی جاتی ہی، اور اس میں بھی بالخصوص وہ حصہ جہاں انھوں نے اللہ تعالیٰ کی زبان سے بندہ کی توبیخ کی ہی، روز بیان کیلئے مشہور ہی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:-

"اگر تو ہمکو صمیم قلب سے حاضر و ناظر، سمیع و بصیر و قادر جانتا تھا، تو گناہ پر تجھکو کیونکر جسارت ہوتی تھی؟ تو بھولکر کبھی بھاڑ میں تو نہیں کودا؟ کبھی کھولتے پانی میں تو تو نے ہاتھ نہیں ڈالا؟ کبھی جلتی ہوئی آگ کو تو نے مٹھی میں نہیں لے لیا؟ مگر تو گناہوں کا نہایت بے باکی سے مرتکب ہوتا تھا۔ ضرور ہی کہ یا تو تجھکو یقین نہ تھا کہ گناہ کی سزا آتش دوزخ ہے، یا اگر یقین تھا تو تو اسکو دنیا کی آگ سے کمتر سمجھتا تھا۔ دنیا میں جو کچھ رفاہ جو کچھ عیش و آرام ہم نے تجھکو بے استحقاق صرف اپنی مہربانی سے عطا کیا تھا، کیا تو نے اسکو ہمیشہ اپنی جہد و تدبیر کی طرف منسوب نہیں کیا؟ جو تکلیف تجھکو دنیا میں پہنچی اگرچہ تو اپنی ہی [illegible]ں میں کلہاڑی مارا کرتا تھا، مگر کیا تو اسکا الزام ہماری ذات مستجمع الصفات پر نہیں لگاتا تھا۔ اے احسان فراموش! ہزاروں لاکھوں احسان میں نے تجھپر کئے اور تجھ سے اتنا نہ ہو سکا کہ بھلا منہ سے اقرار تو کرتا۔ اے ناشکر بے شمار نعمتیں میں نے تجھ کو عطا فرمائیں مگر تجھ پر اتنا بھی اثر نہ ہوا کہ کبھی زبان پر تو لاتا۔ جتنا میں نے تیرے ساتھ سلوک کیا، اتنا ہی تو میری مخالفت پر کمر بستہ رہا، جتنی میں

تیری رعایت کرتا رہا، اسیقدر تو گستاخ اور شریر ہوتا گیا۔ اس حیات بے ثبات پر تجھ کو اتنا گھمنڈ ہو گیا تھا کہ تو اپنے تئیں ہماری خدائی سے باہر لے چلا تھا۔ اس چندروزہ زندگی پر تو اسقدر مغرور تھا کہ دائرہ عبودیت سے اپنے تئیں خارج کرنا چاہتا تھا" (توبتہ النصوح، صفحہ ۱۶۱)

مولانا حالی کی تصانیف میں تو اسقدر بلند اور پرزور عبارت ملنی مشکل تھی، البتہ ان کے متفرق مضامین میں "زبان گویا" کے عنوان سے ایک خطیبانہ پرزور مضمون ملگیا ہے جس کا ابتدائی حصہ ملاحظہ ہو۔

"اے میری بلبل ہزار داستان! اے میری طوطی شیوا بیان! اے میری قاصد، اے میری ترجمان! اے میری وکیل، اے میری زبان! سچ بتا تو کس درخت کی ٹہنی اور کس چمن کا پودا ہے؟ کہ تیرے ہر پھول کا رنگ جدا اور تیرے ہر پھل میں ایک نیا مزا ہے۔ کبھی تو ایک ساحر فسوں ساز ہے جس کے سحر کا رد، نہ جادو کا اتار۔ کبھی تو ایک افعی جاں گداز ہے جس کے زہر کی دارو، نہ کاٹے کا منتر۔ تو وہی زبان ہے کہ بچپن میں کبھی اپنے ادھورے بولوں سے غیروں کا جی لبھاتی تھی اور کبھی اپنی شوخیوں سے ماں باپ کا دل دکھاتی تھی۔ تو وہی زبان ہے کہ جوانی میں کہیں اپنی نرمی سے دلوں کا شکار کرتی تھی اور کہیں اپنی تیزی سے سینوں کو فگار کرتی تھی"

"اے میری زبان! دشمن کو دوست بنانا اور دوست کو دشمن [illegible] ایک کھیل ہے جس کے تماشے سیکڑوں دیکھے اور ہزاروں دیکھنے باقی ہیں [illegible] بنی بات کی بگاڑنے والی! اور اے میرے بگڑے کاموں کو سنوارنے والی! ارد ستے کو ہنسانا اور ہنستے کو رلانا، روٹھے کو منانا اور بگڑے کو بنانا، نہیں معلوم تو نے کہاں سیکھا؟ اور کس سے سیکھا؟ کہیں تیری باتیں لب کی گانٹھیں ہیں اور کہیں تیرے بول شربت کے گھونٹ ہیں۔ کہیں تو شہد ہے اور کہیں خنظل، کہیں تو زہر ہے

اور کہیں تریاق" (مضامین حالی، صفحہ ۲۱)

آزاد، نذیر احمد اور حالی کی انشا پردازی کے اختراعات فائقہ (ماسٹر پیس) آپ نے دیکھ لئے، جو عام طور پر اردو کے انتخابات میں داخل ہیں، اب ایک میری طرف سے شبلی کی انشا پردازی کا نمونہ بھی ملاحظہ ہو، "ظہور قدسی" کے عنوان سے آنحضرت صلعم کی ولادت کا واقعہ وہ اس طرح لکھتے ہیں:۔

"چمنستان دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آچکی ہیں، چرخ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزم عالم اس سر و سامان سے سجائی ہے کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئی ہیں۔

"لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیر کہن سال دہر نے کروروں برس صرف کردیے، سیارگان فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے، چرخ کہن مدتہائے دراز سے اسی صبح جاں نواز کے لئے لیل و نہار کی کروٹیں بدل رہا تھا، کارکنان قضا و قدر کی بزم آرائیاں، عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ و خورشید کی فروغ انگیزیاں، ابر و باد کی تردستیاں، عالم قدس کے انفاس پاک، توحید ابراہیم، جمال یوسف، معجز طرازی موسیٰ، جاں نوازی مسیح، سب اسی لئے تھے کہ یہ متاعہائے گراں ارز شاہنشاہ کونین کے دربار میں کام آئیں گے۔

"آج کی صبح وہی صبح جاں نواز، وہی ساعت ہمایوں، وہی دور فرخ فال ہے۔ ارباب سیر اپنے محدود پیرایۂ زبان میں لکھتے ہیں کہ آج کی رات ایوان کسریٰ کے [illegible] کنگرے گر گئے، آتشکدۂ فارس بجھ گیا، دریائے سادہ خشک ہو گیا، لیکن سچ یہ ہے کہ ایوان کسریٰ نہیں، بلکہ شان عجم، شوکت روم، اوج چین کے قصرہائے فلک بوس گر پڑے۔ آتش فارس نہیں بلکہ جحیم شر، آتشکدۂ کفر، آذر کدۂ گمرہی سرد ہو کر رہ گئے، صنمخانوں میں خاک اڑنے لگی، بتکدے خاک میں مل گئے، شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا، نصرانیت کے اوراق خزاں دیدہ ایک ایک

کر کے جھڑ گئے ۔ توحید کا غلغلہ اٹھا، چمنستانِ سعادت میں بہار آگئی، آفتاب ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں، اخلاق انسانی کا آئینہ پرتو قدس سے چمک اٹھا ۔

"یعنی یتیم عبداللہ، جگر گوشۂ آمنہ، شاہِ حرم، حکمرانِ عرب، فرماں روائے عالم، شہنشاہِ کونین، عالمِ قدس سے عالمِ امکان میں تشریف فرمائے عزت و اجلال ہوا، اللّٰھم صلِّ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم" (سیرۃ النبی حصہ ۱ صفحہ ۱۲۲ و ۱۲۴)
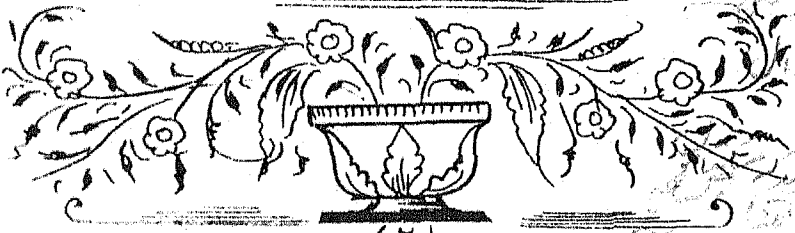
(۲)

گزشتہ صفحات میں، جہاں تک سوال کے پہلے جزو کا تعلق تھا، ہم نے انشاپردازی اور اسکی خصوصیات سے کسیقدر تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے، تاکہ انشاپردازی کا ایک صحیح مفہوم اور معیار قایم ہو جائے ۔ اب تک اردو کے سب سے بڑے انشاپرداز کی تعیئن میں جو غلطی ہوتی چلی آئی ہے اُس کا سبب یہی تھا کہ انشاپردازی کا کوئی صاف و صحیح مفہوم پیشِ نظر نہیں ہوتا تھا ۔ اسی غرض سے ہم نے ان مصنفین کی تحریروں سے مختلف نوعیتوں کے نمونے بھی دیے ہیں، جن سے یہ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ علامہ شبلی کا درجہ اپنے معاصرین انشاپردازوں میں کسقدر بلند ہے! سوال کا دوسرا جزو اسقدر پیچیدہ اور بحث طلب نہیں ہے ۔ کم [illegible] سمجھتا ہے کہ اردو کے ذخیرۂ علمی میں سب سے بڑا اور بیش بہا حصہ [illegible] بلی کا ہے، تاہم ان میں سے ہر ایک کی تصانیف پر ایک سرسری نظر ڈال لینے سے اس خیال کی مزید تصدیق ہو جائیگی ۔

اردو کا سرمایہ علمی ہم جیسا کہ اوپر لکھ آئے ہیں، اردو ادب (یہاں ادب سے مراد

ضمیمہ

فہرست کتب جو زیر مطالعہ تھین

(۱) کولیر کاؤچ (Quiller Couch)

۱- فن تحریر (Art of writing)

(۲) فریڈرک ہیرسن (Frederick Harison)

۲- انتخاب کتب ((Choice of books)

(۳) مہاتما گاندھی:-

۳- "ینگ انڈیا" (کتابی صورت مین جو چھپکر شائع ہوا ہے)

(۴) ایم مہدی حسن:-

۴- افادات مہدی

(۵) پروفیسر محمد حسین آزاد:-

۵- آب حیات

۶- نیرنگ خیال

۷- دربار اکبری

۸- سخندان فارس

۹- دیوان ذوق

(۶) خواجہ الطاف حسین حالی:-

۱۰- حیات سعدی

۱۱- حیات جاوید

۱۲- یادگار غالب

۱۳- مقدمہ شعر و شاعری

(۷) ڈپٹی نذیر احمد:- ۱۴- توبۃ النصوح

۱۵۔ مراۃ العروس

۱۶۔ نبات النعش

۱۷۔ رویاے صادقہ

۱۸۔ الحقوق والفرائض

۱۹۔ مصحف القران

۲۰۔ درباری لکچر

۲۱۔ مجموعہ خطوط نذیر احمد

(۸) علامہ شبلی نعمانی:۔

۲۲۔ سفرنامہ مصر وشام وروم

۲۳۔ الفاروق

۲۴۔ المامون

۲۵۔ سیرۃ النعمان

۲۶۔ سوانح مولینا روم

۲۷۔ شعر العجم (ہر چہار حصص)

۲۸۔ الغزالی

۲۹۔ الکلام

۳۰۔ علم الکلام

۳۱۔ مضامین عالمگیر

۳۲۔ موازنہ انیس و دبیر

۳۳۔ سیرۃ النبی

۳۴۔ مکاتیب (ہر دو حصص)

۳۵۔ رسایل شبلی

۳۶۔ مقالات شبلی

سعید انصاری، علی گڑھ ۳۱ جنوری ۲۵ء